MAUR-116 (N)

Urdu Tarjamanigari

MAUR-116 (N) اردو ترجمہ نگاری

فہرست

بلاک1 :

اکائی1-ترجمے کا فن،اردو میں ترجمے کی اہمیت وروایت..........8
اکائی2-ترجمے کے بنیادی مسائل،اصول اور نظریات..........23
اکائی3-نثری اور منظوم ترجمے..........42

بلاک2 :

اکائی4-اردو میں علمی،فنی وادبی تراجم کی اہمیت وروایت..........58
اکائی5-اردو میں دفتری وقانونی تراجم کی اہمیت وروایت..........71
اکائی6-اردو میں صحافتی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل..........80
اکائی7-اردو میں سائنسی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل..........91
اکائی8-اردو میں مذہبی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل..........101
اکائی9-اصطلاح سازی کے اصول ومسائل اور مخطوطات کے تراجم..........121
اکائی10-اردو ترجمے کے ممتاز ادارے(ابتدا تا حال)..........127
اکائی11-عالمی سطح پر ترجمے کی روایت اور آفاقیت(اردو کے ابتدائی تراجم)..........140
اکائی 12: اردو میں مفہومیاتی (semantic)،ترسیلی (Communicative)،متنی تراجم (Textual Translation) اور حکائی ترجمے کی روایت (Oral Tradition of Translation) اہمیت اور اطلاق..........148
اکائی 13: مترجم (Translator)،ترجمہ کار (Translation) کا فرق نقل ترجمہ (Translitreation) اور انفرادی نوعیت کے تراجم..........159
اکائی14: اردو ترجمہ کے اقسام،لسانی مسائل اور امتیازات..........169

کورس کا تعارف

زبان عالمی سطح پر محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کراتی ہے۔گردونواح کے احساسات کو معنوی جہتیں عطا کرتی ہے۔انھی احساسات سے وابستگی اور تعلق کا جنم ہوتا ہے،اور یہی تعلق یا وابستگی سماج میں زندہ رہنے کا ہنر سکھاتا ہے۔زبان انسانی تعلقات کے اس تانے بانے سے محبت کے دھاگے بنتی ہے۔اپنی تاریخ کے سنہرے پہلو اور خمیر سے جوڑے رکھتی ہے۔مختلف زبانوں کا مطالعہ،تہذیبی رکھ رکھاؤ،خیالات کی ہمہ رنگی اس رشتے کو نئی سمت و رفتار عطا کرتے ہیں۔دنیا میں کئی زبانیں اور بولیاں مروج ہیں۔ ہر زبان اور بولی میں فکر و احساس کا تخلیقی ادب موجود ہے۔لہذا فکر وادب کے اس خزینے سے لطف اندوز ہونے کے لئے ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک زبان کے مواد اور متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام''ترجمہ'' ہے۔

لفظ ترجمہ انگریزی کے لفظ Translation کے مترادف ہے۔ٹرانس کے معنی ہیں''کنارہ''۔اور لیشن کے معنی''لے جانا''۔اس طرح ٹرانسلیشن ایک کنارے سے دوسرے کنارے لے جانے کا عمل ہوا۔
پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی ترجمے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترجمہ دراصل متنی انکشاف کا ایسا تخلیقی عمل ہے جو Target Language اور Source Language کے ذریعے زبان وادب اور تہذیب وثقافت کو فروغ دیتا ہے۔بلکہ اس سے زبان جو تہذیب کی بھی علامت ہوتی ہے اور قوموں کے جذبات واحساسات کا اظہار بھی ترجمے کے ذریعے اس قوم کی تاریخ وتمدن ،تہذیب ومعاشرت،بود و باش علم و ہنر غرض کہ قصہ حیات کے ہر پہلو کے ساتھ لسانی خصوصیات،فکر وفلسفہ،اور مدرکاتِ ترجمہ سے واقف ہوتے ہیں۔افہام وتفہیم،نئے امکانات وا ہوجاتے ہیں۔''

(حوالہ؟؟ کتاب کا نام اور صفحہ نمبر)

ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا۔جاگیرداری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جا بجا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علوم وفنون کے ترجمے کرانے کے لئے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے جاتے تھے،چن چن کر علوم وفنون اور زبانوں کے علما بلائے جاتے تھے۔زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا سرکاری سطح پر انتظام کیا جاتا تھا۔ترجموں کے کامیاب مخطوطے شاہانہ تحفوں اور ہدیوں میں بھیجے جاتے تھے،اشوک اعظم کے پاٹلی پترا میں،بنی عباس کے بغداد میں،بنو فاطمہ کے قاہرہ اور سکندریہ میں،عہدِ اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارالترجمہ ملتا ہے۔پھر ان مقامات سے جو ترجمے نکلے ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا،جن میں وہ ترجمے کئے گئے تھے۔نہایت قریبی مثال کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے

ترجموں کے ذریعے دور دراز کی زبانوں نے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں چھوٹی چھوٹی دھاروں کے پاٹ چوڑے کئے ہیں اوران سے زیادہ گہرائی اورروانی پیدا کی ہے۔

اس کورس میں ہم ترجمے کا فن، اردو میں ترجمے کی اہمیت، ترجمے کے بنیادی مسائل اورنثری ومنظوم تراجم کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ نیز اردو زبان میں علمی، دفتری، قانونی اور صحافتی تراجم کے متعلق بھی جایں گے۔اس کے علاوہ اردو کے اہم مترجمین سے متعارف ہوں گے۔

اکائی 1 ''ترجمے کا فن، اردو میں ترجمے کی اہمیت وروایت'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں غالب کے عہد، ان کے سوانحی کوائف اوران کی شخصیت کے امتیازات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔اس میں ہم غالب کے عہد اور ان کی شخصیت دونوں پہلوؤں سے متعارف ہوں گے۔

اکائی 2 ''ترجمے کے بنیادی مسائل، اصول اور نظریات'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں مرزا غالب سے قبل اردو ادب میں شاعری کی روایت اوراس کی خصائل پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 3 ''نثری اور منظوم ترجمے'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں غالب کے ہم عصر شعرا اوران کی شاعری کی انفرادیت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اکائی 4 ''اردو میں علمی، فنی وادبی تراجم کی اہمیت وروایت'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں غالب کی غزلوں کا فکری وفنی جائزہ لیتے ہوئے ان کی خصوصیت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 5 ''اردو میں دفتری و قانونی تراجم کی اہمیت و روایت'' پر مبنی ہے۔ اس میں قصیدہ گوئی کے حوالے سے غالب کی شعری خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی 6 میں ''اردو میں صحافتی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل'' پر گفتگو کی گئی ہے۔اس میں غالب کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 7 ''اردو میں سائنسی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں خطوط غالب کی خصوصیات اوران کی انفرادیت وار دو ادب میں خطوط غالب کی اہمیت وافادیت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 8 ''اردو میں مذہبی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں غالب کے فارسی خطوط کے مجموعے 'دستنبو' کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز تاریخ غدر میں ان خطوط کی دستاویزی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 9 ''اصطلاح سازی کے اصول ومسائل اور مخطوطات کے تراجم'' پر مبنی ہے۔اس میں بحیثیت مورخ غالب کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔غالب کی غزلوں اورنثری نگارشات میں تاریخ کے جو نکات

ملتے ہیں ان کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 10 ''اردو ترجمے کے ممتاز ادارے (ابتدا تا حال)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں غالب کی غزلوں کو آغا محمد باقر کی شرح 'بیان غالب' کے توسط سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ساتھ ہی شارح بیان غالب کے کی تشریحات کے آئینے میں غالب کی غزلوں اوران کے فن پر گفتگو کی گئی ہے۔

اکائی 11 ''عالمی سطح پر ترجمے کی روایت اورآفاقیت (اردو کے ابتدائی تراجم)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں مشہور ادیب و ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'تفہیم غالب' جس میں غالب کی منتخب غزلوں کی تشریح شامل ہے،اس کے حوالے سے غالب کی فکری وفنی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اکائی 12 ''اردو میں مفہومیاتی (semantic)،ترسیلی (Communicative)،متنی تراجم (Textual Translation)اور حکائی ترجمے کی روایت(Oral Tradition of Translation)اہمیت اوراطلاق'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں شامل نصاب غالب کی غزلوں کی شرح کرتے ہوئے ان کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔جس کے طلبا کو غالب کی غزلوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اکائی 13: ''مترجم (Translator)، ترجمہ کار (Translation) کا فرق نقل ترجمہ (Translitreation)اورانفرادی نوعیت کے تراجم'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔

اکائی14: ''اردو ترجمہ کے اقسام،لسانی مسائل اورامتیازات'' پرمبنی ہے۔

بلاک1 :

اکائی1 –ترجمے کافن، اردو میں ترجمے کی اہمیت وروایت

اکائی2 –ترجمے کے بنیادی مسائل، اصول اور نظریات

اکائی3 –نثری اور منظوم ترجمے

اکائی 1: ترجمہ کا فن، اردو میں ترجمے کی اہمیت و روایت

ساخت

1.1 اغراض و مقاصد
1.2 تمہید
1.3 ترجمہ کا فن، اردو میں ترجمے کی اہمیت و روایت
1.3.1 ترجمے کی تعریف، فن اور اہمیت
1.3.2 اردو میں ترجمے کی اقسام
1.3.3 اردو ترجمے کی روایت
1.4 ماحصل
1.5 آپ نے کیا سیکھا؟
1.6 اپنا امتحان خود لیجیے
1.7 فرہنگ
1.8 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبہ و طالبات! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ:

- ترجمے کی تعریف بیان کرسکیں
- ترجمے کے فن کے بنیادی اصولوں کو سمجھ سکیں گے۔
- اردو میں ترجمے کی روایت اور اس کے تاریخی پس منظر سے واقف ہوسکیں گے۔
- اردو میں ترجمے کی مختلف اقسام کو جان سکیں گے۔
- علمی، ادبی، اور سماجی سطح پر اردو تراجم کی اہمیت کو بیان کرسکیں۔
- اردو ترجمہ نگاری میں درپیشم شکلات اور ان کے ممکنہ حل پر غور کرسکیں گے۔

- اہم اردو مترجمین اوران کے تراجم سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔
- اردو میں تخلیقی اور معنوی ترجمے کی مہارتوں کو عملی طور پر استعمال کرسکیں گے۔
- مغربی ادب کے تراجم کی معلومات حاصل کرسکیں۔

1.2 تمہید

عزیز طلبہ وطالبات! ترجمہ محض ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ کی منتقلی کا عمل نہیں بلکہ یہ مختلف ثقافتوں، خیالات، اور علوم کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔ اردو میں ترجمے کی روایت کافی پرانی ہے، جو مختلف تہذیبوں اور علمی ذخائر سے استفادے کا ذریعہ رہی ہے۔ ابتدائی دور میں فارسی اور عربی متون کا اردو میں ترجمہ کیا گیا، جبکہ جدید دور میں مغربی ادب، سائنس، اور فلسفے کے تراجم نے اردو کو مزید وسعت دی۔

ترجمہ ایک تخلیقی فن بھی ہے، جو مترجم سے نہ صرف دونوں زبانوں میں مہارت کا تقاضا کرتا ہے بلکہ اس بات کی بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ اصل متن کے مفہوم، لہجے، اور جذبات کو برقرار رکھ سکے۔ اس اکائی میں ہم اردو میں ترجمے کی اہمیت، روایت، اور اقسام کا جائزہ لیں گے، ساتھ ہی ساتھ ترجمہ نگاری کے مسائل اور ان کے حل پر بھی بات کریں گے۔

1.3 ترجمہ کا فن، اردو میں ترجمے کی اہمیت وروایت

1.3.1 ترجمہ کی تعریف اور فن

عزیز طلبہ و طالبات! ترجمہ زبانوں کے درمیان ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جس میں الفاظ، جملوں، اور خیالات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے، اس طرح کہ اصل مافی الضمیر اور مفہوم برقرار رہے۔ ترجمہ محض لفظی منتقلی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس میں ثقافتی، سماجی، اور جذباتی پہلو بھی شامل ہوتے ہیں، تاکہ قاری کو وہ حاصل ہو جو اصل متن کے قریب تر ہو۔

ترجمہ عربی زبان سے ماخوذ ہے۔ عربی میں ترجمہ دو معنوں میں مستعمل ہے۔ پہلا مفہوم کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا بجز اس کے کہ جس کلام کا ترجمہ کیا گیا ہے اس کے معانی کی وضاحت کی جائے۔ ترجمہ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ایک کلام کا مطلوب ومقصود دوسری زبان میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ آیئے اب ہم ترجمہ کے لفظ پر غور کرتے ہیں۔ الحاج مولوی فیروز الدین نے جامع فیروز اللغات میں ترجمہ کے معنی بتائے ہیں:

''ترجمہ۔ تر۔ ج۔ مہ (ع۔ ا۔ مذکر) ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرنا، جمع تراجم''

مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ جلد اول ص ۶۰۸ پر ترجمہ کے یہ معنی ملتے ہیں:

''ترجمہ۔ ع۔اسم مذکر۔ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کیا ہوا۔اُلتھا''

صاحب لغات کشوری کے تحت ترجمہ کے معنی یہ ہیں:

''ترجمہ۔ ع۔ایک زبان کے مطلب کو دوسری زبان میں بدلنا اور معنی اس کے بیان کرنا''

(ص ۹۷)

اردو کی تمام لغات میں ترجمہ کے معنی ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کیا ہوا اور ایک زبان کے مطلب کو دوسری زبان میں بدلنا۔اردو کی ان لغات میں ترجمہ کی 'ج' پر زبر کا نشان ہے البتہ فرہنگ عامرہ کو عربی فارسی الفاظ کی لغت کے اعتبار سے اردو میں مستند تسلیم کیا جاتا ہے اور کثرت العوام میں ترجُمہ ہی رائج ہے۔اس طرح سے اردو میں اس کا صحیح تلفظ ترجُمہ ہی ہے۔

ترجمہ نگاری ایک مشکل، نازک اور نہایت اہم فن ہے۔ یہ ایک طرح سے مرصع سازی کا کام ہے۔ مترجم کو بنیادی زبان اور ٹارگیٹ زبان یعنی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہونی چاہیے۔کسی دوسری زبان کی تصنیف کو سمجھنا، اس کے مفہوم کی روح میں اتر کر اس کو اسیر کرنا اور اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ ہے۔ ترجمہ دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے درمیان ایک پل ہے۔ترجمہ کے بارے میں مختلف آرا ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو، دوسرا خیال یہ ہے کہ مترجم اصل فن پارے کو اپنی زبان میں دوبارہ تخلیق کر دے۔مگر اس کی تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں خیال، فہم، احساس، جذبہ اور علم کو منتقل کرنے کا عمل گویا ترجمہ ہے۔

ترجمہ کے فن میں فنی پیچیدگیاں، فنی دشواریاں اور فنی تقاضے زیادہ ہیں۔ترجمہ کی راہیں کٹھن، دشوار کن اور سنگلاخ ہیں۔ان دشوار کن اور سنگلاخ راہوں سے گزرنا اور کامیاب ہونا نہایت مشکل امر ہے۔اس لیے ماضی میں ترجمہ کو ناممکن قرار دیا گیا۔اٹھارویں صدی عیسوی کے مشہور انگریزی نقاد ڈاکٹر جانسن کا خیال ہے کہ:

''شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا''

بیسویں صدی کے گرانٹ شاورمن نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ:

''ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے''

بیسویں صدی کے رابرٹ فراسٹ کا قول ہے کہ:

''ترجمہ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے''

پروفیسر ایلبرٹ گیرالڈ نے کہا:

''ترجمہ، نام ہے ایک سعی نامشکور کا، جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف

حقارت ملتی ہے۔''

اس طرح کی قیاس آرائیوں کی وجہ سے ترجمہ نگاروں کو بہت کچھ سہنا پڑا۔ مذہبی کتابوں کے ترجمہ نگاروں کو بہت ذلیل کیا گیا۔مثلاً ولیم ٹنڈیل نے پہلی بار جب بائبل کا ترجمہ عبرانی سے انگریزی میں کیا تو اسے جلا وطن کر دیا گیا۔اسی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلی نے پہلی بار قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تو ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔لیکن ان سب مشکلات، واقعات و کیفیات کے باوجود ترجموں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔جس کی وجہ سے پوری دنیا والے ایک دوسرے کے نظریات اور خیالات کو سمجھنے لگے۔اردو میں ترجمے کی روایت ،مختلف علمی اور ادبی تحریکوں سے جڑی ہوئی ہے، جہاں فارسی ،عربی،اور بعدازاں انگریزی متون کا ترجمہ کیا گیا۔ترجمے کے ذریعے علوم کا تبادلہ اور نظریات کی ترسیل ممکن ہوتی ہے،اور یہ ادب ،تعلیم ،صحافت،اور مذہبی متون میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اس ضمن میں نصیر احمد خان اپنے مضمون ''ترجمہ اور لسانیات'' میں رقمطراز ہیں:

> ''ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح لے آنا کہ دونوں قالبوں میں ایک ہی روح ہو۔ یہاں لباس ،جسم اور روح سے مراد ترجمہ کی زبان ،اصل عبارت کا مرکزی خیال اور وہ تاثر ہے جو پڑھنے کے بعد دل و دماغ میں قائم ہو جاتا ہے۔''

قمر رئیس ،ترجمہ کا فن اور روایت ،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،۲۰۰۴ء،ص ۱۲۳

ترجمے کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ مترجم دونوں زبانوں کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے کس حد تک اصل متن کے مفہوم، لہجے اور جذبات کو نئی زبان میں منتقل کر پاتا ہے۔اس عمل میں مترجم کو زبان کے صرف لغوی معانی پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ تحریر کے پس منظر، سیاق،اور مقصد پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے تاکہ ترجمہ بامعنی اور موثر ہو۔ترجمہ کے لیے چند باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔پہلی جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس زبان کی لغت، مزاج، صرفی ونحوی خصوصیات، محاورات و اصطلاحات، اس زبان کی تاریخ اور ادب سے واقفیت ضروری ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ کے لیے ترجمہ کی زبان پر پوری مہارت ہونی چاہیے یہاں تک کہ خود لکھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔یعنی جس فن میں وہ ترجمہ کر رہا ہو اس فن میں وہ تخلیقی صلاحیت رکھتا ہو اور اس زبان کی ساخت، قواعد، تشبیہات، استعارات، تلمیحات، محاورات، اسم وفعل اس کی تہذیب اور اس کے کلچر سے بھی واقفیت ضروری ہے۔لیکن اہم شرط ترجمہ کے لیے خیال اور مفہوم کی مکمل ادائیگی ہے۔ایک تصنیف کے علم اور اس کے معنی ومفہوم کو پوری دیانتداری کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ ہندی کے شاعر ڈاکٹر بچن کا کہنا ہے کہ اگر مترجم اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیت کا مالک ہو اور ترجمہ دیانتداری سے کرے تو اس کا ترجمہ اصل تخلیق سے زیادہ وقیع فن پارہ بن سکتا ہے۔ایک کامیاب اور اچھا ترجمہ بذات خود ایک فن ہوتا اور یہ اسی وقت ممکن ہے

جب وہ اصل کی کیفیت اور احساس کو ممکن ترین حد تک دوبارہ خلق کیا ہو۔ ترجمہ کا عمل دوطرفہ جنگ لڑنے کے برابر ہے یہ دوطرفہ جنگ اصل زبان اور بنیادی زبان دونوں سے ہے۔ جارج اسٹائنرؔ جس نے علامہ اقبال کی اکثر نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، کہتا ہے کہ ترجمہ ایک زندہ چنگاری ہے۔ یہ ماضی ، حال اور تہذیبوں کے درمیان توانائی کا بہاؤ ہے۔ وہ آگے کہتا ہے کہ اپنے وجود کی جگہ دوسرا وجود اختیار کرنے کا قریب ترین امکان اسی میں ہے کہ خود کو کسی دوسری زبان میں غرق کر دیں۔ بعض اوقات اپنی آرزوؤں، خواہشوں او جذبوں کا اظہار خود اپنی ہی زبان میں دشوار معلوم ہوتا ہے۔ ذہن و دل پر جو کیفیتیں اور وارداتیں گذرتی ہیں ان کا بیان لب پر یا نوک قلم پر پوری شدت کے ساتھ لانا مشکل ہوتا ہے۔ مگر ترجمہ نگار کی یہ ہمت ہوتی ہے کہ کسی اور مصنف کے ذہنی و قلبی تاثرات کو اپنے اوپر مسلط کر کے ان میں ڈوب کر ترجمہ کی زبان میں جوں کا توں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ترجمہ کی زبان میں اصل فن پارہ کو از سرِنو زندہ کرتا ہے، یہ زندہ کرنے کا عمل گویا از سرِنو تخلیق کرنا ہے۔ اس رو سے دیکھا جائے تو ترجمہ بذاتِ خود ایک تخلیق ہوتا ہے۔

عزیز طلبہ و طالبات! جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر زبان میں لفظ اور معنی کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ لفظ چونکہ ایک خاص مفہوم ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر لفظ اصل معنی میں استعمال ہوا ہے تو لغت سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مجازی معنی مقصود ہیں تو لغت کام نہیں دے گی۔ یہاں مترجم کی صلاحیت و قابلیت درکار ہوتی ہے۔ اس لیے لفظ شناسی بے حد ضروری ہے۔ ہر زبان میں کسی شئے، مقام، شخص، ضمیر اور خواص کے اظہار کے لیے مخصوص الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور یہ الفاظ اپنے اندر خاص کیفیتیں رکھتے ہیں۔ یہ کیفیتیں لفظ کے ذریعے ہی سننے یا پڑھنے والے تک پہنچتی ہیں۔ مثلاً 'جی' لفظ ہے جس کے معنی طبیعت کے ہیں۔ جس سے جی متلانا، جی کا اچھا ہونا، جیسے ٹکڑے بنتے ہیں۔ کسی نے پکارا تو جواب میں بھی 'جی' کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ سوالیہ انداز میں بھی کہا جائے گا جس کا مطلب ہوگا 'آپ نے کیا کہا' مترجم کو ایسی باریکیوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ اسی طرح ہر زبان میں استعجابیہ الفاظ مثلاً اف، اوہ، آہ، ہائے وغیرہ۔ ایک خاص کیفیت کی نمائندگی کرتے ہی۔ یہ اردو میں مستعمل ہونے والے الفاظ ہیں۔ دیگر زبانوں میں استعجابیہ الفاظ مختلف اور جداگانہ ہوتے ہیں۔ ترجمہ کے دوران ایسے ہم معنی الفاظ اور متبادل الفاظ معلوم کرنا اور ان کا مناسب استعمال کرنا نہایت ضروری ہے۔ اردو میں کا، کی، کے، کو، سے، سی، پر وغیرہ بے معنی الفاظ ہیں۔ جو رابطے کا کام کرتے ہوئے جملوں کی ساخت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جبکہ بامعنی الفاظ اپنے طور پر معنی دیتے ہیں جیسے، اسکول، دروازہ، شہر، گھر، دیوار وغیرہ۔ مترجم کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ ان الفاظ کو کب، کہاں اور کیسے استعمال کرنا ہے۔ ہر زبان میں ذومعنی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں ایسے ذومعنی الفاظ کے لیے ترجمے کی زبان کے لیے موزوں ترین الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ ترجمہ کے دوران بسا اوقات مختصرات (Short forms) سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ مترجم کو اصل زبان اور ترجمہ کی زبان میں استعمال

ہونے والے مختصرات کا علم ہونا ضروری ہے۔ مثلاً انگریزی کے UNO، WHO،SAARC، TV، UNICEF ، وغیرہ مختصرات اگر ترجمہ کے دوران آئیں تو ان کا ترجمہ اردو میں کرتے وقت پورے الفاظ کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ زبانوں میں عام طور پر ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ غیر مروج یا متروک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب زبان ارتقائی مراحل طے کرتی ہے تو بہت سے الفاظ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں یا پھر ان کا رواج کم ہو جاتا ہے۔ مثلاً سوں، سیں، تے، تلک، ٹک، ستے، جیوں وغیرہ دکنی الفاظ کا چلن اب نہیں رہا۔ زبانوں میں ایسے بھی الفاظ ہوتے ہیں جن کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے جن کے استعمال سے وہ ساری تاریخ اور ساری کیفیت ذہن میں آجاتی ہے۔ مثلاً کوہ کن، لن ترانی، آتش نمرود، صبر ایوب، ید بیضا، لکشمن ریکھا، راون راج، دستر ہرن، رام لیلا، عدل جہانگیری وغیرہ کا ہندوستانی زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ان الفاظ کی تہہ میں پوشیدہ مفہوم کا اوران کی پوری تاریخ کا علم مترجم کو ہونا ضروری ہے۔ انگریزی کے بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو "S" کے لگنے پر جمع میں بدل جاتے ہیں اور اکثر الفاظ ایسے بھی ہیں کہ "S" کے لگنے پر معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ Good (اچھا) Goods (مال واسباب) Forse (قوت) Forces (افواج) Arm (ہاتھ) Arms (اسلحہ) وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے ترجمہ کرنا چاہیے۔

ہر زبان میں ہر علم اور فن کے الفاظ مخصوص ہوتے ہیں جنہیں اصطلاحات کہتے ہیں۔ یہ الفاظ علم اور فن کی کنجی کا کام کرتے ہیں۔ اصطلاح ایک معین معنی دینے والا لفظ ہے جس کے معنی مخصوص ہوتے ہیں۔ ترجمہ کے عمل کے دوران اصطلاح سازی بے حد ضروری ہے۔ دور حاضر میں انگریزی کے بہت سارے الفاظ اردو لب ولہجہ کے مطابق تھوڑی بہت سی ترمیم کے ساتھ اردو میں استعمال ہو رہے ہیں۔ جیسے Romance سے رومان، Techincal سے تکنیکی، Scientific سے سائنسی Mechanical سے میکانیکی وغیرہ جو اردو سے میل کھاتے ہیں۔

ترجمہ کے لیے اصل زبان اور ترجمہ کی زبان کی لسانی خصوصیات سے مکمل آگاہی نہایت ضروری ہے۔ ترجمہ دراصل لسانی عمل نہیں بشریاتی عمل ہے لیکن لسانیات کا عمل دخل بھی ترجمہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے لسانی آہنگ پر عبور ہونا مترجم کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ ترجمہ کرتے وقت قواعد، اسم، ضمیر، فعل، صوتی نظام، مرکبات، زمانہ، رموز واوقاف، لغت کا استعمال، بلاغت، ضرب الامثال اور روزمرہ محاورے، تشبیہ، استعارہ، تلمیحات، ہئیت، اسلوب، جملے، مبالغہ ورنگ آمیزی، روح کی منتقلی، تہذیبی وثقافتی روایات وغیرہ کا علم مترجم کو ہونا بہت ضروری ہے۔

1.3.2 ترجمے کی اقسام

ترجمے کا عمل محض الفاظ کے ایک زبان سے دوسری زبان میں تبادلے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس میں

مفاہیم، سیاق، اور تخلیقی اظہار کی منتقلی بھی شامل ہے۔ اردو میں ترجمے کو بنیادی طور پر تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: لفظی ترجمہ، مفہومی ترجمہ، اور تخلیقی ترجمہ۔ ہر قسم کا اپنا ایک منفرد انداز اور مقصد ہوتا ہے، جسے مترجم اپنی ضرورت کے مطابق اختیار کرتا ہے۔

لفظی ترجمہ:

لفظی ترجمہ (Literal Translation) میں مترجم ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں جوں کا توں منتقل کرتا ہے، بغیر اس بات کی پروا کیے کہ اصل پیغام کا مفہوم یا جذبات مکمل طور پر منتقل ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کے ترجمے میں الفاظ کے لغوی معنی کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ مثال:

انگریزی جملہ: He kicked the bucket

اردو لفظی ترجمہ: ''اس نے بالٹی کو لات ماری'' (حالانکہ اس کا حقیقی مطلب ''اس کا انتقال ہو گیا'' ہوتا ہے)۔

لفظی ترجمہ عموماً نصابی یا سائنسی مواد کے لیے مفید ہوتا ہے، جہاں زبان کا درست اور دقیق استعمال ضروری ہو۔ تاہم، یہ تخلیقی یا ادبی متون میں اکثر بے معنی یا مضحکہ خیز ہو سکتا ہے۔

مفہومی ترجمہ:

مفہومی ترجمہ میں مترجم الفاظ کے بجائے اصل متن کے مفہوم اور سیاق پر زور دیتا ہے۔ اس عمل میں مترجم کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ اصل متن کے جذبات اور مقصد کو بہتر انداز میں نئی زبان میں پیش کرے، چاہے الفاظ کچھ مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ مثال:

انگریزی جملہ:He kicked the bucket

اردو مفہومی ترجمہ: ''اس کا انتقال ہو گیا''۔

مفہومی ترجمہ ادبی اور صحافتی متون میں زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس میں مترجم کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے ثقافتی اور سماجی فرق کو مدنظر رکھے۔

تخلیقی ترجمہ:

تخلیقی ترجمہ (Creative Translation) میں مترجم نہ صرف متن کا مفہوم منتقل کرتا ہے بلکہ اس میں تخلیقی اظہار اور زبان کی خوبصورتی کا بھی اضافہ کرتا ہے۔ اس قسم کے ترجمے میں مترجم کو مکمل آزادی ہوتی ہے کہ وہ الفاظ اور جملوں کی ساخت کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے مطابق نئے انداز میں ترتیب دے۔

مثال:

انگریزی نظم کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم اصل متن کا مفہوم برقرار رکھتے ہوئے اردو میں شعری آہنگ اور

خوبصورتی کا بھی خیال رکھتا ہے۔

اصل:Twinkle, twinkle little star

How I wonder what you are

تخلیقی ترجمہ:

''چمکتا ہے تُو، اے ستارے، پیارے،

کیا ہے تُو، یہ دل سے پکارے''

تخلیقی ترجمہ عموماً شاعری، کہانیوں، اور ڈراموں میں کیا جاتا ہے تاکہ اصل متن کے جذبات اور تخلیقی پہلو کو برقرار رکھا جا سکے۔

یہ تینوں اقسام اردو ترجمہ نگاری میں مختلف مواقع اور ضروریات کے تحت استعمال ہوتی ہیں۔ مترجم کی مہارت اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کب اور کہاں کس قسم کا ترجمہ اختیار کرے تاکہ اصل متن کا پیغام اور اثر نئی زبان میں مؤثر انداز میں منتقل ہو سکے۔

1.3.3 اردو میں ترجمے کی روایت

اردو زبان میں ترجمے کی روایت ایک طویل اور متنوع تاریخ ہے، جو مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں اور زبانوں سے متاثر رہی ہے۔ یہ روایت علمی، ادبی، اور مذہبی متون کی منتقلی کے ذریعے زبان کی ترقی اور وسعت کا باعث بنی۔ اردو میں ترجمے کا عمل ابتدائی طور پر مذہبی اور درباری ضروریات کے تحت شروع ہوا، تاہم بعدازاں یہ علمی و ادبی تحریکوں کا حصہ بن گیا۔

اردو میں پہلے ترجمہ کی اگر بات کریں تو ہمیں ''راسلس'' از ڈاکٹر سیموئل جانسن کے ترجمہ ''تواریخ راسلس، شہزادہ حبش کی'' اس سید محمد میر لکھنوی مغرب کی زبان سے اردو میں ہونے والا کتابی صورت میں پہلا ادبی ترجمہ ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنی کتاب ''ہندوستانی زبان کے قواعد'' 1796ء میں، ولیم شیکسپیئر کے دو ڈراموں ''ہملٹ'' اور ''ہنری ہشتم'' کے دو چیدہ اقتباسات کا اردو میں ترجمہ پیش کیا تھا۔ اولین مترجم میں سید محمد میر لکھنوی، ریورنڈ چارلس کی چھ جلدوں پر کمیسٹری سے متعلق کتاب 1828ء میں طبع کروا چکے تھے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب میر امن دلی والے نے ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کے بعد ریوری رنٹ چارلس کی سات جلدوں پر مشتمل کتاب ''ستہ شمسیہ'' کا ترجمہ غلام محی الدین متین حیدرآبادی، مسٹر جونس اور موسیو تندوسی کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔ عزیز طلبہ وطلبات جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اردو زبان کی تشکیل میں فارسی اور عربی کا گہرا عمل دخل رہا۔ اس کے ابتدائی دور میں درباروں اور مذہبی اداروں میں فارسی کا راج تھا، اور عوامی سطح پر بھی فارسی متون کا اردو میں ترجمہ ضروری سمجھا گیا۔ صوفیا کرام اور مذہبی علماء نے اسلامی تعلیمات کو عام فہم زبان میں پیش کرنے کے

لیےعربی اور فارسی کتب کے اردو تراجم کیے۔ ان تراجم کا مقصد دین کا پیغام عوام تک پہنچانا اور صوفیانہ افکار کو عام کرنا تھا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی شخصیات نے اسلامی کتب کے تراجم میں اہم کردار ادا کیا، جنہوں نے قرآنِ مجید کے علاوہ حدیث اور فقہ کے متون کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔

مغلیہ سلطنت کے دور میں فارسی درباری زبان تھی، مگر عوامی سطح پر اردو کا فروغ ہو رہا تھا۔ اس دور میں علمی اور تاریخی کتابوں کے اردو تراجم شروع ہوئے تاکہ عوام کو علم اور حکمت کے ذخائر تک رسائی مل سکے۔ داراشکوہ، جو صوفی مزاج شہزادہ تھا، نے مختلف مذاہب کے متون کے تراجم کو فروغ دیا، جیسے کہ اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ۔ یہ تراجم بعد میں اردو میں منتقل ہوئے اور بین المذاہب ہم آہنگی کی راہ ہموار کی۔ مذہبی شعور کی تقویت کے لیے شاہ رفیع الدین دہلوی نے قرآن کا لفظ بہ لفظ اردو ترجمہ کیا۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد برطانوی عہد میں اردو میں ترجمے کا دائرہ وسیع ہو گیا اور انگریزی متون کے تراجم کی روایت نے زور پکڑا۔ اس دور میں انگریزی علمی، سائنسی، اور قانونی کتب کے تراجم کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ جدید علوم تک رسائی حاصل کی جا سکے۔

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کا قیام (1800) اردو میں ترجمہ نگاری کے فروغ کا سنگِ میل ثابت ہوا۔ اس ادارے نے مختلف زبانوں سے اردو میں تراجم کے ذریعے اردو نثر کو فروغ دیا۔ یہ کالج برطانوی حکومت کی نگرانی میں قائم کیا گیا تھا، اور اس کا بنیادی مقصد ہندوستان میں برطانوی اہلکاروں کو مقامی زبانوں میں مہارت فراہم کرنا تھا تاکہ وہ مقامی معاشرت اور زبانوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ فورٹ ولیم کالج نے ترجمے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی اور ان کاموں کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ اس کالج نے نہ صرف مقامی زبانوں میں متعدد اہم کتب کا ترجمہ کیا بلکہ ہندوستانی ادب میں ترجمے کی روایت کو باقاعدہ طور پر فروغ دیا۔ ترجمہ نگاروں نے فارسی، عربی، سنسکرت اور ہندی سے اردو میں اہم کتابیں ترجمہ کیں جن میں میر امن کی سب سے مشہور کتاب ''باغ و بہار'' ہے جو فارسی کی کتاب قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے۔ میر شیر علی افسوس نے دو کتابیں اردو میں ترجمہ کیں اور کالج کے منصوبے کے تحت مقامی ادب میں تعاون کیا۔ فارسی کتاب '' گلستان'' کا اردو ترجمہ ''باغ اردو'' سے کیا اور ''آرائش محفل'' سجان رائے بٹالوی کی کتاب ''خلاصۃ التواریخ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مشہور زمانہ مثنوی ''سحر البیان'' کو ''نثر بے نظیر'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ جان گلکرسٹ کی فرمائش پر مفرح القلوب'' کا ''اخلاق ہندی'' کے نام سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تاریخ آسام کا ''تاریخ آسام'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مظہر علی ولا نے ''مادھونل کام کندلا'' کے نام سے سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے شیخ سعدی کے مشہور پند نامہ کا منظوم اردو ترجمہ ''ترجمہ کریما'' کے نام سے کیا۔ آداب معاشرت کے مختلف پہلوؤں پر مبنی واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کو''ہفت گلشن'' کے نام سے اردو میں ترجمہ

کیا۔ کاظم علی جوان نے ''سکنتلا'' کے نام سے کالی داس کے مشہور ڈرامے کو اردو میں ترجمہ کیا۔ نہال چند لاہوری نے فارسی قصہ ''گل بکاولی'' کا اردو میں ''مذہب عشق'' کے نام سے ترجمہ کیا۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام 1864ء میں سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں کیا۔ اس کا مقصد جدید سائنسی اور علمی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا تھا تاکہ ہندوستانی عوام کو مغربی علوم اور سائنسی ترقی سے آگاہ کیا جاسکے۔ اس سوسائٹی کے تحت جن کتابوں کو اشاعتی پروگرام میں شامل کیا گیا تھا ان کی تعداد 28 تھی اور یہ کتابیں سائنس، ریاضی، معاشیات، سیاسیات، تاریخ، زراعت، منطق، جغرافیہ، طبقات الارض اور فلسفہ وغیرہ کے موضوعات پر مشتمل تھیں۔ سرسید احمد خان نے انگریزی اور مغربی افکار کے تراجم کے ذریعے مسلمانوں میں جدید تعلیم اور سائنسی فکر کے فروغ کی کوشش کی۔ انہوں نے خود بھی متعدد سائنسی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب نذیر احمد دہلوی، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، شاد عظیم آبادی، راشد الخیری اور مرزا ہادی رسوا اردو میں ناول نگاری کے چلن کو عام کرنے میں مصروف تھے۔ ناولوں کے سینکڑوں تراجم ہوئے اور اردو کے ناول نگاروں پر انگریزی کے ناول نگاروں کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد پر اسٹی ون سن اور جارج ایلیٹ کا اثر تھا۔ ''بنات النعش'' ٹامس ڈے کا چربہ ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا ''فسانہ آزاد'' اور ''خدائی فوجدار'' سروانتیس کے ''ڈان کیخو تے ڈی لا مانشا'' اور سجاد حسین کے ''حاجی بغلول'' وغیرہ ترجمے کی شکل میں ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے تاریخی ناولوں کی عمارت سر والٹر اسکاٹ اور چرڈسن کی فراہم کردہ بنیادوں پر کھڑی کی ہے۔ انہوں نے ایک ترجمہ رینالڈز کے ناول کا ''خوبی قسمت'' کے نام سے بھی کیا۔ مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی کے پانچ جاسوسی ناولوں کو ''خونی بھید''، ''خونی جورو''، ''خونی مصور''، ''خونی عاشق'' اور ''بہرام کی رہائی'' کے نام سے کیا۔ ان کے بعد جاسوسی ناولوں کا اردو ترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری نے کیا۔ انہوں نے 110 ناولوں کا انگریزی سے اردو ترجمہ کیا۔ ان کے بعد ترجمہ کی باقاعدہ روایت چلی جن میں مولانا عبدالمجید سالک نے مغرب ک ناول نگار آر۔ ایل اسٹیونسن کے ناولوں کا ترجمہ کیا۔ شاہد حسین، اشفاق احمد، ابن سلیم اور بشیر ساجد نے ارنسٹ ہیمنگوے کے ناولوں کا ترجمہ کیا۔ محمد حسن عسکری، حمید اختر، بشیر چشتی، ڈاکٹر افضل اقبال، تیرتھ رام فیروز پوری، ن۔م۔راشد، مولوی عنایت اللہ دہلوی، عبدالرزاق ملیح آبادی، ابن انشا، سلیم صدیقی، ایم۔جے عالم، احسن طاہر، ابوسعید قریشی، مولانا عبدالحمد سالک، سید حسن رضوی، سیدہ نسیم ہمدانی، یوسف عباسی، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، رئیس احمد جعفری، مولانا ظفر علی خاں، کندن لال شرر، اثر لکھنوی، شان الحق حقی، خان احمد حسین خاں، حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، عشرت رحمانی، سجاد ظہیر، شفیق الرحمن، مظہر الحق علوی، منشی خلیل الرحمن، عزیز احمد، محمد ہادی حسین وغیرہ ایسے نام ہیں جن کے اردو میں ترجمے سے نہ صرف اردو ناول کا چلن عام ہوا بلکہ ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی سمجھنے میں مدد ملی۔

پارسی اسٹیج کے فروغ کے ساتھ ہی انگریزی سے اسٹیج ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا اور ولیم شیکسپئر کی عالمگیر شہرت سے باکس آفس پر کامیابی کا تصور بندھا۔ ڈرامے کے اولین مترجم میں احسان اللہ کا نام شامل ہے۔ جس نے شیکسپیئر کے 'اوتھیلو' کا ترجمہ 1890ء میں شائع کروایا۔ آغا حشر نے 'King Lear' کا ترجمہ 'سفید خون' کے نام سے کیا جوان کا نمایاں کام ہے۔ رومیو جولیٹ اور جولیئس سیزر کے ڈراموں کا ترجمہ عزیز احمد اور مولوی عنایت اللہ دہلوی نے کیا۔ ڈاکٹر عابد حسین نے گوئٹے کا ڈراما 'فاؤسٹ'، محمد عمر و نور الٰہی نے مولئیر کے ڈراما کا ترجمہ 'بگڑے دل' کے نام سے کیا۔ مغرب کے ڈراما نگاروں میں آسکر وائلڈ (مترجم: مجنوں گورکھپوری، تمکین کاظمی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو اور حسن عباس)، آندریف (مترجم: ابوسعید قریشی)، ٹی۔ ایس ایلیٹ (قرۃ العین حیدر) ٹالسٹائی (مترجم: مجنوں گورکھپوری، جارج برنارڈ شا (مترجم: مخدوم محی الدین و مولوی میر حسین، مجنوں گورکھپوری، محمد اکبر وفا قانی، خورشید نگہت)، شلر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی)، گوئٹے (مترجم: شاہد احمد دہلوی، منشی جوالا پرشاد برق، عبدالقیوم باقی، منور لکھنوی، عزیز احمد) کے تراجم قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد اردو ڈرامے کو رفیع پیر، خواجہ معین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور اسد محمد خان جیسے اچھے ڈراما نگار مل گئے۔

افسانے کی صنف میں تین نام زیادہ ترجمہ ہوئے یعنی چیخوف، موپاساں اور رابندر ناتھ ٹیگور۔ ٹیگور کو انگریزی کی معرفت اردو میں متارف کروانے میں پریم چند پیش پیش تھے اور یہ سلسلہ منٹو تک چلا۔ منٹو نے چیخوف اور موپاساں کو نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ ان کے طرزِ تحریر کو عام کرنے میں حصہ لیا۔ اسی طرح ٹالسٹائی اور گورکی بھی منٹو کی معرفت اردو میں متعارف ہوئے۔ سمرسٹ ماہام کو بطور افسانہ نگار اردو میں سادہ زبان اور سہل انداز نگارش کے باعث مقبولیت حاصل ہوئی۔ روسی افسانہ نگاروں کا واضح اثر محمد مجیب کے اولین افسانوی مجموعے 'کیمیا گر اور دوسرے افسانے' میں دیکھنے کو ملا۔ جاوید صدیقی نے اسٹیفن کرین کا، ابن انشا نے ایڈگر ایلن پو کا، مجنوں گورکھپوری نے ٹاس ہارڈی وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد مغربی ادب کی کئی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ جن میں خالد سہیل اور جاوید دانش کی کتاب 'ورثہ' اور منیر الدین احمد کی 'معاصر جرمن ادب' اہم کتابیں ہیں۔ لاطینی امریکہ کے افسانوں کے تراجم پر مبنی آصف فرخی کی کتاب 'موت اور قطب نما' میں کئی اہم افسانوں کا ترجمہ کیا گیا۔ اردو میں منظوم تراجم کے باب میں انور زاہدی کی کتاب 'بارشوں کا موسم'، محمد اکرام چغتائی اور اسلم کولسری کی آسٹریا کی جدید شاعری پر مبنی کتاب 'ایک نظر کافی ہے' اہمیت کی حامل ہیں۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں سجاد حیدر یلدرم سے لے کر تا حال تک ترجمے نے ایک اہم روایت قائم کی ہے۔ یہ دیا سے دیا جلنے کی وجہ سے آج ہم ایک روشن فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ تراجم کی اہمیت اور اس تمدن کی ہمہ گیر اثرات عالمی سطح پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ جدید دور میں بھی اردو کے کئی ادیب، محقق اور مترجمین نے ترجمے کو فروغ دیا۔ معروف مترجمین جیسے ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس حوالے سے اہم خدمات انجام دیں، جن کے تراجم نے اردو

ادب کو عالمی معیار کے برابر لا کھڑا کیا۔

آج کے دور میں اردو میں ترجمے کا عمل جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے مزید آسان ہو گیا ہے۔ ڈیجیٹل ذرائع کے ذریعے فوری تراجم ممکن ہو چکے ہیں، اور عالمی ادب اور سائنسی مواد اردو میں دستیاب ہونے لگا ہے۔ گوگل ٹرانسلیٹ اور دیگر ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اردو میں ترجمے کو عام کر رہے ہیں، تاہم تخلیقی اور مفہومی تراجم کی ضرورت آج بھی باقی ہے۔ موجودہ دور میں اردو تراجم عالمی سطح پر رابطے اور ثقافتی تبادلے کا اہم ذریعہ بن چکے ہیں۔ اردو میں ترجمے کی یہ روایت نہ صرف زبان کی ترقی کا باعث بنی بلکہ مختلف علوم، نظریات، اور تہذیبوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کیا۔ ترجمہ نگاری کی یہ روایت آج بھی جاری ہے اور نئی جہتیں اختیار کر رہی ہے، جو اردو زبان کو مزید مضبوط اور متنوع بنا رہی ہے۔

1.4 ماحصل

عزیز طلبہ و طالبات! ہم نے ترجمے کی تعریف، اہمیت، فن، اور اردو زبان میں ترجمے کی روایت پر تفصیلی گفتگو کی۔ ترجمہ، جیسا کہ ہم نے سمجھا، محض لفظی تبدیلی نہیں بلکہ ایک زبان کے خیالات، جذبات، اور اس کی ثقافتی اہمیت کو دوسری زبان میں پیش کرنے کا فن ہے۔ ترجمہ کسی بھی زبان کے ادبی و علمی اثاثے کو مزید وسیع اور مضبوط کرتا ہے، جس سے نہ صرف علمی تبادلہ ممکن ہوتا ہے بلکہ مختلف تہذیبوں کے درمیان ایک پل کا کام بھی کرتا ہے۔ یہ پل عالمی سطح پر مختلف نظریات، روایات، اور علمی ورثے کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

ترجمے کی روایت کو سمجھتے ہوئے، ہم نے دیکھا کہ اردو زبان میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اردو ادب کی ابتدائی تاریخ میں ہی فارسی، عربی اور سنسکرت سے ترجمے کا آغاز ہوا، جس سے اردو زبان میں علم و ادب کا وافر ذخیرہ آیا۔ خاص طور پر دکن کے عہد میں ترجمہ نگاری کو بڑا فروغ ملا، جس نے علمی میدان میں اردو کے قدم جمانے کی راہ ہموار کی۔ اس دور میں کئی اہم مذہبی، فلسفیانہ اور علمی کتب کے تراجم ہوئے جو آج بھی اردو ادب کا حصہ ہیں۔ شمالی ہند میں بھی ترجمے کی روایت مزید مضبوط ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد سرسید احمد خان اور ان کی 'سائنٹفک سوسائٹی' نے اردو زبان میں جدید علوم اور سائنس کی ترویج کے لیے اہم کام کیا۔ سرسید کے دور میں اردو زبان کو سائنسی، فلسفیانہ اور تعلیمی مواد کا ایک اہم وسیلہ بنانے کے لیے یورپی اور دیگر زبانوں کی کتابوں کے تراجم کیے گئے۔ ان تراجم کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی عوام کو دنیا کے جدید ترین علمی رجحانات سے روشناس کرایا جائے اور اردو کو ایک علمی زبان کے طور پر فروغ دیا جائے۔ اس کے بعد ہم نے جدید دور میں ترجمے کے فن کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔ آج کی دنیا میں، جب دنیا گلوبلائزیشن کے تحت مزید مربوط ہو چکی ہے، ترجمے کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو چکا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ نے بھی اس روایت کو نئی جہتیں دی ہیں، جس سے نہ صرف

کتابیں بلکہ تحقیقی مواد، سائنسی مضامین، اور عالمی ادب بھی دنیا بھر میں مختلف زبانوں میں فوری طور پر قابل رسائی ہے۔ تاہم، جدید تکنیکی سہولیات کے باوجود ترجمہ نگاری میں انسانی تخلیقیت اور فکری بصیرت کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کامیاب ترجمہ وہی ہوتا ہے جو دونوں زبانوں کے ثقافتی، سماجی اور فکری پس منظر کو سمجھ کر کیا جائے۔ اردو ادب میں ترجمے کی روایت نے ہماری زبان کو عالمی سطح پر بھی معتبر بنایا ہے۔ یہ روایت آج بھی زندہ ہے، اور موجودہ دور میں اردو کے کئی ادیب، محقق اور مترجمین اس کو فروغ دے رہے ہیں۔ معروف مترجمین جیسے ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس حوالے سے اہم خدمات انجام دیں، جن کے تراجم نے اردو ادب کو عالمی معیار کے برابر لا کھڑا کیا۔ ان کے علاوہ، اردو میں مختلف عالمی ادب کے تراجم، چاہے وہ افسانے ہوں، ناول ہوں، دیگر علوم وفنون یا فلسفیانہ متون، اردو قارئین کو دنیا کی مختلف تہذیبوں اور نظریات سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

1.5 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبہ وطالبات! اس اکائی کے مطالعے سے آپ:

- ترجمے کی بنیادی تعریف، اس کی اہمیت کو سمجھ اور جان سکے۔
- ترجمے کی مختلف اقسام کو مکمل طور پر سمجھنے میں کامیاب ہوئے۔
- یہ جان پائے ہیں کہ ترجمہ زبانوں کے درمیان علمی، ثقافتی، اور فکری تبادلے کا سب سے اہم وسیلہ ہے، جس کے بغیر مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں ایک دوسرے سے نہ مل پاتیں۔
- اردو میں ترجمے کی روایت اور اس کے ارتقاء کے مراحل کا ادراک حاصل کر سکے ہیں، جس میں خاص طور پر فورٹ ولیم کالج اور سرسید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی کی خدمات سے واقف ہوئے۔
- یہ جان سکے ہیں کہ ترجمہ اردو زبان میں علمی، سائنسی، اور فکری ترقی کا اہم ذریعہ ہے۔
- کلاسیکی اور جدید دور میں ترجمے کے فن اور اس کی تکنیکوں کو سمجھا ہے۔

1.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ ترجمہ کی تعریف کیجیے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
2۔ ترجمہ کی اقسام اور ہر قسم کی خصوصیات کی وضاحت کیجیے۔
3۔ اردو میں ترجمے کی روایت کیسے شروع ہوئی اور اس میں کن افراد اور اداروں کا اہم کردار رہا؟
4۔ سرسید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ترجمے خدمات کا جائزہ لیجیے۔
5۔ اردو میں علمی، سائنسی، اور فکری مواد کے ترجمے کی اہمیت کیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

6۔ ترجمے کے عمل میں کون کون سے چیلنجز پیش آتے ہیں اور ان چیلنجز سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے؟

1.7 فرہنگ

(مشکل الفاظ)		(معنی)
مترجم	:	وہ شخص جو ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔
تقابلی لسانیات	:	مختلف زبانوں کے موازنے کا مطالعہ تاکہ ترجمے میں درست معنوی متبادلات فراہم کیے جاسکیں۔
ثقافتی تناظر	:	ترجمے میں ثقافتی حوالوں اور مخصوص زبان کی روایات کو مدنظر رکھنا۔
مفاہیم	:	مختلف زبانوں میں مفہوم کے لطیف فرق جو ترجمے میں اہم ہوتے ہیں۔
زبان کی بوقلمونی	:	زبان میں موجود مختلف معنوی اور نحوی پہلو جو ترجمے کو پیچیدہ بناتے ہیں۔
اسلوب	:	متن کی مخصوص طرزِ بیان یا انداز جو ترجمے میں بھی منتقل ہونا ضروری ہے۔
معانیاتی یکسانیت	:	ترجمے میں اصل زبان کی معنوی یکسانیت کا برقرار رہنا۔
لغویاتی جزئیات	:	ترجمے میں ہر لفظ کے مخصوص معنی اور اس کے دقیق جزئیات پر توجہ۔
سیاق وسباق	:	متن میں موجود الفاظ کا پس منظر اور حالات، جو ترجمے کو متاثر کرتے ہیں۔
مرکبی تراجم	:	پیچیدہ جملوں یا اصطلاحات کو مناسب طور پر دوسری زبان میں منتقل کرنا۔
اصطلاح سازی	:	نئی زبان میں نئے الفاظ یا اصطلاحات کا تخلیق کرنا۔
تشکیلِ معنی	:	ترجمے میں اصل زبان کے معنوی عناصر کو نئی زبان میں ڈھالنا۔
معنیاتی تفہیم	:	ترجمہ کرتے وقت متن کے گہرے معنی کو سمجھنا۔
غیر متغیرات	:	اصل زبان کے مخصوص الفاظ یا جملے جو ترجمے میں تبدیل نہیں ہوتے۔
نحویات	:	ترجمے میں زبان کے قواعد اور جملوں کی ساخت۔
بین المتنی	:	مختلف زبانوں کے ادبی وثقافتی متون کے مابین تعلق۔
ترسیلی دقیقت	:	ترجمے میں مواد کو نہایت محتاط انداز میں منتقل کرنا۔
کثیر لسانیت	:	مختلف زبانوں میں ترجمے کی استعداد اور ضرورت۔
معنوی استحکام	:	ترجمے میں اصل مواد کی معنوی وضاحت اور استحکام۔

1.8 کتب برائے مطالعہ

1۔ قمر رئیس : ترجمہ کا فن اور روایت

2۔	مرزا حامد بیگ	:	ترجمے کا فن
3۔	خلیق انجم (مرتبہ)	:	فن ترجمہ نگاری
4۔	محمد طیب دہلوی	:	انگریزی ترجمہ کا فن

اکائی 2 ترجمے کے بنیادی مسائل، اصول اور نظریات

ساخت

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 ترجمہ کی تعریف وتفہیم

2.3.1 ترجمے کے بنیادی مسائل

2.3.2 ترجمہ کے اصول

2.3.3 ترجمے کے نظریات

2.4 آپ نے کیا سیکھا؟

2.5 اپنا امتحان خود لیجیے۔

2.6 سوالات کے جوابات

2.7 فرہنگ

2.8 کتب برائے مطالعہ

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ ترجمہ کی تعریف اور مفہوم سے واقف ہوں گے۔

☆ ترجمے کے بنیادی مسائل کی جانکاری حاصل کریں گے۔

☆ ترجمے کے مختلف نظریات سمجھ سکیں گے۔

☆ ترجمے کے اصولوں سے آگاہی حاصل کرسکیں گے۔

2.2 تمہید

ہم سب کارل مارکس کے اس دانشورانہ قول سے واقف ہیں:

’’احتساب سے ادب سنورتا ہے‘‘ میں نے اس قول کی وضاحت اس طرح کی ہے’’ جینے کی دشواریاں

ہی اس زندگی کو فلسفیانہ اور فن کارانہ طور پر شفافی عطا کرتی ہیں۔آزادی کا فقدان ہی آزادی کے تصور کا شعور پیدا کرتا ہے۔محبت سے محرومی ہی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ ہمارا اکیلا پن ہی برادری کے معنی کو ہمارے لئے قابلِ فہم بناتا ہے،ادب میں سب سے زیادہ استعجال سے جو چیز مجھے مخاطب کرتی ہے وہ اس کی مایوسیانہ شدت ،اندرونی،اجبار،اور شدومد سے اس سچائی کی دریافت کے لئے تگ ودو ہے۔''

یہی وہ خاص حالتیں ہیں،جن کے تحت یہ حیات افروز تگ ودویعنی (کائنات کو منظّم کرنے والا تعقل جو لفظ کے روپ میں اظہار پاتا ہے)اور زبان کی حرمت کی راہ وا کرتی ہیں۔اس حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے ادب کا دوسری زبانوں کے مزاج کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔اس کے لئے سب سے اہم وسیلہ ''زبانوں کی منتقلی '' ہے۔جسے ہم ترجمہ کہتے ہیں۔عہدِ جدید میں یہ ایک اہم ضرورت ہے۔جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔چنانچہ اپنی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے،اسے گلوبیک علم سے واقف کرنے اور جدید ٹیکنالوجی کا ساتھ دینے کے لئے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔

ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔لفظوں کا یہ بامعنی کھیل جب رنگ،سنگ،حرف وصوت کے پردوں پر طلوع ہوتا ہے تو فن کی گہرائی تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔اور جب مشکل تمثالوں کو لفظی گہرائیاں نصیب ہوتی ہیں تو طلسمی نثر وادب کی پیچ دار راہداریاں بھی از خود کھلتی چلی جاتی ہیں۔ان حقیقتوں کے کواڑ وا کرنے والے مترجم کہلاتے ہیں۔

2.3 ترجمہ کی تعریف وتفہیم

زبان عالمی سطح پر محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتی ہے۔گردونواح کے احساس کو معنی دیتی ہے۔اس احساس سے تعلق کا جنم ہوتا ہے،اور یہی تعلق سماج میں زندہ رہنے کا گر سکھاتا ہے۔زبان انسانی تعلقات کے اس تانے بانے سے محبت کے دھاگے بنتی ہے۔اپنی تاریخ کے سنہرے پہلو اور خمیر سے جوڑے رکھتی ہے۔مختلف زبانوں کا مطالعہ،تہذیبی لین دین،خیالات کی ہمہ ہمی اس رشتے کو نئے پر عطا کرتا ہے۔دنیا میں کئی زبانیں اور بولیاں ہیں۔ہر زبان اور بولی میں فکر واحساس کا تخلیقی ادب موجود ہے۔لہٰذا فکر وادب کے اس خزینے سے لطف اندوز ہونے کے لئے ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ''ترجمہ'' ہے۔

لفظ ترجمہ انگریزی کے لفظ Translation کے مترادف ہے۔ٹرانس کے معنی ہیں ''کنارہ''۔اور لیشن کے معنہ ہیں ''لے جانا''اس طرح ٹرانسلیشن ایک کنارے سے دوسرے کنارے لے جانے کا عمل ہوا۔

پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی ترجمے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترجمہ دراصل متنی انکشاف کا ایسا تخلیقی عمل ہے جو Target Language اور Source

Language کے ذریعے زبان وادب اورتہذیب وثقافت کوفروغ دیتا ہے۔ بلکہ اس سے زبان جوتہذیب کی بھی علامت ہوتی ہے اورقوموں کے جذبات واحساسات کا اظہار بھی ترجمے کے ذریعے اس قوم کی تاریخ وتمدن ،تہذیب ومعاشرت، بود و باش علم و ہنرغرض کہ قصہ حیات کے ہر پہلو کے ساتھ لسانی خصوصیات ،فکر وفلسفہ،اور مدرکاتِ ترجمہ سے واقف ہوتے ہیں۔افہام وتفہیم، نئے امکانات وا ہوجاتے ہیں۔''

ترجمہ اقوامِ عالم میں اختلاط اور باہمی روابط کا نہایت عمدہ وسیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر تہذیب وتمدن میں تبادلہ کا پیش خیمہ بلکہ اس کی واحد عملی صورت ہے۔ یہ باہمی لین دین کا اٹوٹ سلسلہ ہے۔ جو ہمیشہ بنی نوع انسان کے لئے سودمند ثابت ہوا ہے۔مثال کے طور پر اگر مذہبیات میں ہم انجیل،قرآن اور وید ،ادبیات میں الف لیلی ، رباعیاتِ عمر خیام ،حکایاتِ سعدی ،شیکسپئر اور ابسن کے ڈراموں اور فلسفہ کی سطح پر افلاطون ،ارسطو،اقبال،رومی ،جنید بغدادی،شاعری میں ،امیر خسرو،کالی داس،ٹیگور،اقبال،میر اور غالب سے روشناس نہ ہوتے ،تو ہم ان کی فکری اورتمدنی حیثیتوں سے محروم رہتے۔

ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے۔اوراس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے جی کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے۔لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کی بدولت اوراس کی خاطر کئی اضافے کئے گئے ہیں۔ ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ،اصطلاحات،محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جوشروعات میں نامانوس ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ زبان پر رواں ہونے لگتے ہیں۔

ترجمے کے ذریعے علمِ انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے اور بہت طویل ہے۔اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔اگلے سرے پر بوعلی سینا، درمیان میں والٹیئر موجود ہے تو پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پاسترنک ،عرب وعجم کے علما نے یونانی ، ہندوستانی فلسفہ،طب، ہیئت ونجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کرکے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔لاطینی و رومی کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کردیا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی ۔والٹئر نے شیکسپیر کا ترجمہ کرکے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اور پاسترنک نے رومی مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔اس دوطرفہ عمل نے مشرق ومغرب کی طنابیں کھینچ دیں۔ باہمی خیر خبر کی گنگا دو سمتوں میں بہنے لگی۔

ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا۔ جاگیرداری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جابجا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علوم وفنون کے ترجمے کرانے کے لئے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے جاتے تھے،چن چن کر علوم وفنون اور زبانوں کے علما بلائے جاتے تھے۔زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا سرکاری سطح پر انتظام کیا جاتا تھا۔ترجموں کے کامیاب مخطوطے شاہانہ تحفوں اور ہدیوں میں بھیجے جاتے

تھے،اشوک اعظم کے پاٹلی پترا میں، بنی عباس کے بغداد میں، بنو فاطمہ کے قاہرہ اور سکندریہ میں، عہدِ اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارالترجمہ ملتا ہے۔ پھر ان مقامات سے جو ترجمے نکلے ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا، جن میں وہ ترجمے کئے گئے تھے۔ نہایت قریبی مثال کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کے ذریعے دور دراز کی زبانوں نے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دھاروں کے پاٹ چوڑے کئے ہیں اور ان سے زیادہ گہرائی اور روانی پیدا کی ہے۔

اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کہیں یہ ترجمے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال ،استعارہ اور اصطلاحوں کی صورت میں، بہر حال یہ بات مسلمہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاوں کے ترجمے اور ترجمانی کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔ لیکن چونکہ ہماری زبان کو منظّم علمی ولسانی کام کا ایک پر سکون زمانہ نصیب نہیں ہوا اور بااقتدار طبقے کی سرپرستی میں پروان چڑھنے کی عمر طبعی اسے نہیں ملی اس لئے ترجموں میں خاص طور سے غیر ذمہ داری برتی گئی ہے، کہیں کہیں غیر زبانوں کا دخل، دخلِ بے جا بھی ہو گیا ہے اور ایسے ترجمے ہوئے ہیں جو زبان کو عوام سے قریب لانے کے بجائے اسے اور دور لے جاتے ہیں۔ ترجموں کو نا قابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔

احتساب بڑی اہم چیز ہے۔ خاص طور سے زبان وادب کے معاملے میں کیونکہ یہ وہ میدان ہے جہاں بے اعتدالی کرنے پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوتی ادب کے لئے سو طریقے احتساب کے مقرر ہیں، علم ،معانی، علمِ بیان عروض یہ سب پیمانے ہیں اور ان پیمانوں سے ناپ ناپ کر نثر ونظم کو دسیکھا س جاتا ہے۔ پھر تنقید کے ذریعے احتساب ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد خود تنقیدی اصول ہیں جو تنقید کا بھی احتساب کرتے ہیں۔ لیکن ترجمہ اگر کامیاب ہو تو بجائے خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے احتساب کا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا۔ اور نہ ایسے پیمانے بنا کر ترجمہ کرنے والوں کے سامنے رکھے گئے جو احتساب کے کام آسکے۔

2.3.1 ترجمے کے بنیادی مسائل

ادب انسان اور کائنات کے درمیان رشتوں کا محسوساتی اور اکتشافی اظہار اور انسانی جبلتوں، خواہشات اور اس کے وجدان کا مظہر ہوتا ہے۔ ادب ایک طرف حظ اور سکون کا باعث ہوتا ہے تو دوسری طرف عقل وفکر کو مہمیز کرنے کا ایک آلہ! اس اعتبار سے ایک متمول ثقافت کے معنی میں دوسرے علوم وفنون کے ساتھ اعلی ادبی شاہکاروں کا موجود ہونا ادب انسان کی ترقی اور اس کی حریت آزادی کی علامت اور ضمانت ہوتا ہے۔

۔بقول جمیل جالبی:

''اگر فارسی روایت ہندوی روایت کواس طور پر نہیں بدلتی تو اس برِاعظم کی قدیم تہذیب گل سڑ کر کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔یعنی یہ کہ اردو نے اپنے بقا کا انتظام بھی کیا اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کو نئی زندگی بھی دی۔ان ادبی ترجموں کے وسیلے ہی سے اردو زبان کی ساخت،اس کا پیرایہء اظہار،اسلوب اوراس کی مستعمل قدیم وجدید اصناف پیدا ہوئیں۔یعنی غزل،قصیدہ،مثنوی،رباعی،قطعہ،نظموں کی ہیئتیں،عروض و بلاغت،داستان وحکایت فارسی ادب کے حوالے سے اردو میں آئے۔اور ناول،افسانہ،ڈرامہ،انشائیہ،سفرنامہ،آزاد نظم،نثری نظم،تنقید وغیرہ مغربیء ادب کے وسیلے سے ظہور پذیر ہوئے۔معنوی جہت کے تحت تصورِ عشق،تصورِ کائنات،تلمیحات،علامات غرض کہ تمام شعریات فارسی اور بعد میں مغربی زبانوں کے ادب کی مرہونِ منت ہے۔ادبی تراجم کے بدولت ہی اٹھارویں صدی کے آخر تک اردو زبان وادب اس قدر متمول اور مستحکم ہو چکا تھا کہ بقول مصحفی:

''ریختہ ہمارے زمانے میں فارسی کے اعلی مرتبے کو پہنچ چکا ہے بلکہ اس سے بہتر ہو گیا ہے۔''یعنی انیسویں صدی کے آخر تک اردو کا کلاسیکل ادب اپنے نقطہ عروج کو پہنچ چکا تھا،جس کے نتیجے میں اس کا زوال آمادہ ہونا منطقی تھا۔اس لئے انیسویں صدی کے آخر میں مغربی زبان وادب سے رجوع کرنا ناگزیر تھا،جس کے باوصف اردو میں انگریزی زبان وادب کے ترجمے کا کام شروع ہوا۔اور اردو زبان وادب نے اپنے نشو ونما کے لئے ایک بار پھر سامان فراہم کئے۔

ادبی ترجمہ ایک تہذیب اوراس کے جمالیاتی عناصر کو دوسری تہذیب میں یکساں اثر آفرینی کے ساتھ منتقل کرنے کا عمل ہے۔اس لحاظ سے علمی ترجموں کے مقابلے میں ادبی ترجمہ سب سے زیادہ مشکل امر ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ شدہ متن میں یکساں آفرینی پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔مترجم کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ترجمے کو اصل کے متبادل کے طور پر پیش کرے۔ظاہر ہے اس کشمکش کی صورتِ حال سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔جن میں سے بعض مسائل نا قابلِ حل ہوتے ہیں۔کسی ادبی ترجمے کے عمل کے پانچ مدارج ہوتے ہیں۔

۱۔ادبی متن کا انتخاب
۲۔متن کی کلی تفہیم
۳۔متن سے ہم آہنگی
۴۔ترسیل وابلاغ
۵۔ترجمہ شدہ متن کا ادب پارہ ہونا

☆ادبی متن کا انتخاب:

اس مرحلے میں مترجم اپنی لیاقت، ذہانت اور ادبی ذوق وشوق کے اعتبار سے ادبی متن کو ترجمے کے لئے منتخب کرتا ہے۔اس انتخاب میں مترجم متن سے پوری وفاداری نبھانے کے لئے پابند ہوجاتا ہے۔اس لئے مترجم کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ متن کی قومی زبان، اس کا عہد، اس وقت کی تہذیب وثقافت اور سماجی و جمالیاتی قدروں کے ساتھ سیاسی وسماجی حالات سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ادبی ترجمے کے لئے دو زبانوں کا جاننا ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے دو تہذیبوں سے واقفیت ضروری ہے۔اس کے ساتھ متن کی قدر و قیمت، اس کے ترجمے کی ضرورت اور اہمیت و افادیت کا تعین بھی مترجم کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے وہ ہی چیزیں اخذ کرنا چاہتی ہے جو اس کی نشونما میں معاون ہوں اس کے لئے ہر ادب پارہ اہم نہیں ہوتا۔اس ذیل میں مترجم کو اپنے عہد کی سیاسی وسماجی صورتِ حال، نظریات ومیلانات، اس عہد کا ادبی ذوق اور مزاج اور ذرائع ترسیل وابلاغ کے رویوں کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔قدیم اردو ادب میں زیادہ تر صوفیانہ نظریات واقدار کو فروغ دینے والے شعری وافسانوی فن پاروں کے ترجمے کئے گئے۔بقول علامہ شبلی نعمانی ''صوفیانہ خیالات واقدار سے استفادہ کی بدولت ہی فارسی ادب وشعر دنیا کے اعلی ادبوں میں شامل ہے۔جب کہ اس عہد میں نظامی اور دوسرے شعرا کے قصائد وہجویات کے نمونے بھی تھے۔اس طرح سرسید تحریک کے دوران مغرب سے حقیقت پسندانہ ادب اور دورِ الیزبیتھ کے ادب کے تراجم ہوئے اور سلیقہ بلند پایہ تخلیقات صرفِ نظر کی گئیں۔جس کے ترجمے بعد کے زمانے میں ہوئے۔ان تمام مثالوں کا مقصد یہ ہے کہ ادبی تراجم دراصل لکھنے والے اور پڑھنے والوں کے لئے باعثِ تربیت ہوتے ہیں۔اس لئے جس زمانے میں جیسا ادب تخلیق ہوتا ہے اسی طرح کے فن پارے بھی ترجمہ ہوتے ہیں۔اس لئے انتخابِ متن ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام معیارات کو برقرار رکھنا مشکل ترین امر ہے۔

☆**متن کی کلی تفہیم:**

اس مرحلے میں انفرادی متن کا مطالعہ اور اس کی کلی تفہیم وابلاغ کا عمل ہوتا ہے۔اس میں مترجم فن پارے کی تہذیب، زبان وبیان، مصنف کی آگہی، اس کی فکر، جذبے، نقطہ نظر، لہجے اور اسلوب کی پوری طرح تفہیم کرتا ہے یہاں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض فن پارے کلی طور پر اور بعض جزوی طور پر ایسے ہوتے ہیں۔جن میں ایک سے زیادہ لہجے Tones ہوتے ہیں اور لہجے سے متن کے مختلف معنی برآمد ہوتے ہیں۔اس طرح بعض فن پاروں میں ایسا وجدانی تجربہ بیان ہوتا ہے جس کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے اظہار سے اس کی معنویت ختم ہوجاتی ہے یا بعض فن پاروں میں اس قدر ابہام ہوتا ہے جس کو اصل زبان میں ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔چنانچہ اس مرحلے میں ذرا سی لغزش فن پارے کی پوری جہت کو تحس نحس کردیتی ہے۔متن کی کلی تفہیم کی وجہ سے ہی ایک متن کے دو ترجموں میں بڑا اختلاف پیدا ہوجاتا ہے جب کہ مترجم اپنے طور پر پوری طرح دیانت دار ہوتا ہے۔

☆متن سے ہم آہنگی:

اس مرحلے میں مترجم متن کو اپنے ذہن و دل اور وجدان کا حصہ بناتا ہے یعنی تخیلی سطح پر متن کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ ہم آہنگی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب فن پارہ مترجم کے ذوق ومزاج اور طبیعت کے مطابق ہوگا۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مترجم کا ذوقِ مزاج فن پارہ پر حاوی ہوجائے۔فن پارہ کا مزاج ہر حال میں مقدم ہوتا ہے۔ترجمہ نگار کو ہر حیثیت سے فن پارہ کے مزاج میں ڈھلنا ہوتا ہے۔مترجم کی ہم آہنگی ہی تخلیقی ترجمے کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔اسی ہم آہنگی کے وسیلے سے اصل معنی آفرینی اور اثر آفرینی کی ترجمے میں بازیافت ہوتی ہے۔یہ ہم آہنگی ایک بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ تمام قابلیتوں اور مہارتوں کے باوجود مترجم کے لئے دوسری زبان اور تہذیب اکتسابی ہی ہوتی ہے۔اس لئے فلم کے ناظرین کی طرح تخیلی سطح پر وہ لاکھ خود کو فلم کا ہیرو تصوّر کرے لیکن وہ رہتا ناظر ہی ہے۔

☆ترسیل وابلاغ:

یہاں مترجم فن پارہ کے معنی ومفہوم اور وجدانی وتخیلی تجربات اور کو قاری کے ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔یہ مرحلہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔خود سمجھنے اور تجربے سے گزرنے سے زیادہ دوسروں کو سمجھنا اور تجربہ سے آشنا کروانا مشکل ہوتا ہے۔ترسیل وابلاغ کا یہ مسئلہ تخلیق سے زیادہ ترجمے میں پیچیدہ ہوتا ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف الفاظ وخیال کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے،جبکہ مترجم مصنف کا پابند ہوتا ہے۔ایسی دو زبانیں جو اپنی تہذیب اور مزاج کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہوتی ہیں۔کسی حد تک اس مسئلے کو حل کرلیتی ہیں،یعنی وہاں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ کوئی لفظ یا ترکیب ترجمے میں من وعن رکھ لی جائے جیسے فارسی ، ہندی،عربی وغیرہ زبانوں سے اردو میں ترجمہ۔لیکن وہ زبانیں جن کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے وہاں ترسیل وابلاغ کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔جیسے انگریزی،فرانسیسی،روسی اور دیگر مغربی زبانوں سے اردو میں ترجمہ۔خصوصاً یہ مسئلہ شعری ترجمے میں ناقابلِ حل ہوتا ہے۔انگریزی کی منظوم شاعری کو اردو میں نظم کے اسی اثر کے ساتھ پیش کرنا ناممکن ہے۔کیونکہ ان دونوں کے صوتیاتی نظام اور عروض وآہنگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔اس لئے شبلی نعمانی نے شاعری کے ترجمے کو شاعری کی موت کے مترادف قرار دیا ہے۔

☆ترجمہ شدہ متن کا ادب پارہ ہونا:

یعنی کوئی فن پارہ ترجمہ ہوکر بھی فن پارہ رہے اور اس کو اصل فن پاروں کے مقابلے میں رکھا جاسکے۔کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فن پارہ کا ترجمہ ترسیل کے نقطہ نظر سے بھرپور ہوتا ہے لیکن اس کی اپنی ادبی حیثیت نہیں ہوتی فقط اس ترجمے کو پڑھ کر اصل فن پارہ کی ادبی حیثیت مشکوک ہوجاتی ہے۔جس کی مثال قرآن کے لفظی تراجم

ہیں۔قرآن ایک مذہبی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کا ایک بلند ترین نمونہ بھی ہے لیکن اس کے تراجم کو بعض اوقات بلند ترین تو کیا؟ ادب کہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔اس لئے اس مرحلے میں مترجم کو فن پارے کے مرکزی خیال، جذبے اور تاثر کے ساتھ اس کے اسلوب، ہیئت کے مطابق ترجمہ ہونے والی زبان کے ادبی مذاق کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔اسی ذیل میں یہ ہوتا ہے کہ دونوں ادبی مذاقوں سے دیانت داری برتنا انتہائی مشکل ہے۔جس کے نتیجے میں ترجمے میں ترجمہ پن کا عنصر پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔یہاں مترجم کی یہ فن کاری ہوتی ہے کہ وہ ترجمے پن کے عنصر کو اس طرح برتے کے وہ قارئین کے لئے قابلِ قبول ہو۔

افسانوی ادب سے مختص تراجم کے مسائل:

شاعری کے مقابلے میں افسانوی ادب زبان کی تہذیبی فضا کو زیادہ وضاحت وصراحت کے ساتھ سمیٹے ہوئے ہوتا ہے اسی لئے افسانوی ادب کے تراجم کے لئے دوزبانوں کی ثقافتی جزئیات سے واقفیت لازمی امر ہے۔یہ واقفیت خود ایک مسئلہ ہوتی ہے۔افسانوی ادب میں بیاسن ہونے والے یا رسم ورواج ،طرزِ معاشرت ،مسائل ،عقائد اور اسی قسم کے دوسرے امور جو فن پارہ کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں اور جن کی رو سے فن پارہ میں معنی پیدا ہوتے ہیں ،ترجمہ کے عمل میں ایک مسئلہ ہوتے ہیں۔ایک مسئلے کو کسی حد تک وضاحتی نوٹ سے حل کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی متن کے بین السطور معنی یعنی وہ معنی جو الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کئے گئے ہیں ترجمے میں ان کی جھلک بہت مشکل ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ الفاظ کی صورت اور آہنگ دے بننے والے پیکر ،تجنیس جیسی رسم الخط اور تلفظ پر مبنی صنعتیں ،رعایتِ لفظی ،مناسبت الفاظ ،مرصع اور مسجع نثر نمونے ترجمے کے عمل میں شکست خوردہ ہوجاتے ہیں۔جیسے اردو کی داستانیں اور انشائیے نہ صرف بیانیہ کی وجہ سے جاذبِ نظر ہیں بلکہ ان کا حسن صنعتوں کے بہترین استعمال میں ہی ہے۔

شعری تراجم سے مختص مسائل:

نثر کا بنیادی اسلوب ترسیلی اور وضاحتی ہوتا ہے جبکہ شاعری رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہی شعر میں وزن ،قافیہ ،ردیف کا بھی التزام ہوتا ہے۔شعر کی یہی مجموعی ہیئت اس کی اثر آفرینی اور وجدانی تجربے کا باعث ہوتی ہے۔اس لحاظ سے شاعری کا ترجمہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔شاعری کے ترجمے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ترجمے کے بعد بھی شاعری رہے۔عجیب قسم کا نثری مجموعہ نہ بن جائے (بعض ماہرین کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم ہی ہونا چاہیے نثری ترجمے سے اس کا شعری لطف زائل ہوجاتا ہے۔) چونکہ ہر زبان کا عروضی اور صوتیاتی نظام جدا اور مختلف اثرات کا حامل ہوتا ہے اس لئے شعر کی اصل کیفیت کا ترجمہ ناممکن ہے۔دوسرا مسئلہ ترسیل وابلاغ کا ہے شاعری چونکہ رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل

ہوتی ہے اور زندہ علامتیں اپنے اندر کئی معنوی جہت رکھتی ہیں اس لئے علامتی لفظ کے بدلنے سے نظم کی پوری کائنات درہم برہم ہوجاتی ہے۔شاعری کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ ایک متن کی مختلف قراتوں سے مختلف معنی برآمد ہوں۔ شاعری معنی آفرینی ،زبان و بیان اور لفظیات کے مخصوص استعمال سے پیدا ہوتی ہے ،رعایتِ لفظی،مناسبتِ الفاظ،الفاظ کے صوتی پیکر،ان کی غنائیت سب کچھ مل کرشعری معانی کی تشکیل کرتے ہیں۔ظاہر ہے ترجمے کے عمل میں ان تمام امور کا ایک ساتھ منتقل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔شاعری کے ترجمے میں صرف شاعرانہ خیال یا اس کا مضمون ہی ترجمہ ہو پاتا ہے۔بقیہ فنی نزاکتیں زائل ہوجاتی ہیں۔مثلا جرمنی ادب کے مایہ ناز ڈرامہ نگاراور شاعر گوئٹے کی شاہکار تخلیق ’’فاوسٹ‘‘ کا نثری ترجمہ عابد حسین نے کیا ہے اوراس کا منظوم ترجمہ منور لکھنوی نے۔ان دونوں ترجموں کا اقتباس ملاحظہ کریں:

عابد حسین

شاعر!میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام نہ ہو جسے دیکھ کر رفعتِ خیال رخصت ہوجاتی ہے۔مجھے اٹھتی ہوئی لہروں کا یہ سیلاب نہ دکھاو جو ہمیں زبردستی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔(نثر)

منور لکھنوی:

کیوں ذکر مجھ سے آخر اسی بھیڑ بھاڑ کا
ہے منظر یہ دیکھ کر دل الجھن میں پڑ گیا ہے
چڑھتی ہوئی ندی ایک
یہ بھیڑ واقعی ہے اک اک نفس میں
کتنی وحشت بھری ہوئی ہے۔

ان دونوں تراجم کے تقابل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عابد حسین کا ترجمہ بہت پرشکوہ ہے جبکہ منور لکھنوی کا ترجمہ سادہ اور بے روح ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اصل متن کا یہ اقتباس نہ تو اتنا سادہ ہے نہ ہی اتنا پرشکوہ۔

☆گرے ایلجی کی نظم کا ترجمہ،نظم طباطبائی نے اچھے انداز میں کیا ہے۔

An Elegy Written in a Country Churchyard
Full many a germ of purest ray
Serene the dark unfothoni'd
Caves of ocean bear full many a flower is born to blush
and waste its sweetness on the desert -air

شامِ غریباں

بہت سے گوہرِ شہسوار باقی رہ گئے ہوں گے

کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک وعنبر کی

2.3.2 ترجمہ کے اصول

فن ترجمہ کے اصول وقواعد، طریقہ کار کے حوالے سے اختلاف ابتدا ہی سے رہا ہے۔ تاہم ناقدین اور مترجمین نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے وضاحتیں کیں۔ جس کے نتیجے میں چند ایک اصول وقواعد سامنے نظر آتے ہیں۔ سید باقر حسین نے الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ اصول بیان کئے ہیں۔ اور ان کے نقطہءنظر کے مطابق الفاظ کا ترجمہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

ا۔ الفاظ کا ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔
۲۔ حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے۔
۳۔ سبک اور خوب صورت ہونا چاہیے۔

جبکہ عبارت کا ترجمہ کرنے کے لئے انہوں نے پانچ بنیادی اصول بتائے ہیں۔

ا۔ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ، اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔
۲۔ ترجمہ حتی الامکان محاورہِ زبان کے مطابق ہونا چاہیے۔
۳۔ الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہیے، تا کہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں باقی رہے۔
۴۔ ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے جن کے مترادفات اردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو۔
۵۔ اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کے تحت ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاو پیدا ہو تو ایسے صورت میں جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

ترجمے کے عمل میں پہلا درجہ الفاظ کے صحیح ترجمے تک رسائی ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے الفاظ تلاش کئے جائیں جو عام فہم ہوں اور ابلاغ کی یعنی TEXT کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جہاں تک اصل متن کے الفاظ کے سبک اور خوب صورت ہونے کا تعلق ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ترجمہ کرتے وقت بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ تا کہ مطلب کی وضاحت اور الفاظ کی قوت میں مشکل پیش نہ آئے۔ جبکہ لفظی ترجمے کا عمل اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر لفظ کا اپنا ایک تہذیبی ثقافتی پس منظر ہوتا ہے۔ کسی لفظ کی مخصوص

فضا سے وابستگی کو سمجھے بغیر اس کا ترجمہ متبادل لفظ کے طور پر استعمال کر دینا، ابہام پیدا کرسکتا ہے۔ترجمے کا یہ عمل اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے جب دونوں کا تعلق لسانی(Target. Language)اور Source) (Language. دونوں زبانوں حوالے سے مختلف ہوں۔ کیونکہ ہر زبان کے الفاظ ،معنی صوت اور گرامر کے ڈھانچے میں اختلاف کے باعث جملوں کی ساخت اوران کے استعمال کے طریقہ کار میں تبدیلی آجاتی ہے۔جس طرح کہ انگریزی اور اردو زبان ایک دوسرے سے لسانی تناظر میں مختلف ہیں۔جبکہ اردو زبان عربی ،فارسی اور پاکستانی زبانیں (پنجابی،سندھی،سرائیکی،کشمیری)و دیگرکئی زبانوں سے لسانی اشتراک رکھتی ہیں۔اس پہلو سے وضاحت کرتے ہوئے ممتاز مترجم شاہد حمید کہتے ہیں کہ:

’’زبانیں ایک دوسرے سے قریب ہوں تو ترجمہ اتنا زیادہ مشکل نہیں رہتا جیسے فارسی اور عربی کی تخلیقات کو اردو میں ترجمہ کرتے وقت زیادہ دشواری اس لئے پیش نہیں آتی کہ جملوں کی ساخت مختلف ہونے کے باوجود اردو کا ذخیرہ الفاظ زیادہ تر انہی دو زبانوں سے آیا ہے۔‘‘

دونوں زبانوں کا تعلق ایک ہی لسانی گھرانے سے ہو تو ترجمہ کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آتی لیکن جب دو زبانوں کا لسانی تعلق مختلف ہو تو یہ صورتِ حال ترجمہ نگاری میں چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ایسے میں مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتا ہو۔ان کی لسانی باریکیوں سے آگاہی رکھتا ہو۔ادبی متن کے حوالے سے خاص طور پر جملے کی ساخت ،محاورے کے استعمال میں مشاق ہو۔مترجم معنی ومفہوم کو اچھے انداز سے ترجمہ کرے تاکہ ترجمہ کی جانے والی تحریر کو اسلوب کی تازگی میسر آسکے۔

معروف انشائیہ نگار اور مترجم سلیم آغا غزلباش ترجمے کے مبادیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

’’ترجمہ چاہے ملکی زبان سے غیر ملکی زبان میں کیا گیا ہو یا غیر ملکی زبان سے ملکی زبان میں،اس کی عموما دو ہی صورتیں مروج ہیں۔اولاً آزاد ترجمہ ثانیاً لفظی یا بامحاورہ ترجمہ۔آزاد ترجمہ کرتے وقت مترجم کی طرف سے حذف یا اضافے کا عمل نمایاں ہوتا ہے۔لہذا اس نوع کے تراجم کا اضافہ کرنے کے بعد قاری اصل فن پارہ کا محض ایک ہلکا سا تاثر ہی قبول کرسکتا ہے۔اس کے برخلاف لفظی ترجمے کا فریضہ احسن طریقے سے انجام پائے تو ایسی صورت میں قارئین تک اصل تخلیق کی ترسیل کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔‘‘

آزاد اور لفظی ترجمہ مغربی اصطلاح ہے۔دونوں طریقہ کار کے مطابق اصل متن کو دوسری زبان کے توسط سے قارئین تک ،اس خوشبو کو پہچانا ہے جو معنوی اور ظاہری صورت میں وحدتِ تاثر کو قابو میں رکھے۔اس طرح آزادانہ ترجمے میں تخلیقی اور جمالیاتی طرزِ عمل کو اپنایا جاتا ہے۔جبکہ لفظی ترجمہ معنی سے اپنا رشتہ برقرار رکھتا ہے۔اس طرح کے ترجمے کو دیانت دارانہ عمل کہا گیا ہے۔کیونکہ لفظی ترجمے یں مترجم اصل متن اور تخلیق کار سے وفاداری نبھاتا ہے۔

Dolet Etienne فرانسیسی شاعراور مترجم نے فنِ ترجمہ نگاری کے پانچ بنیادی اصول وضع کئے ہیں کہ کس طرح سے ایک سے دوسری زبان میں ترجمے کا عمل بہترین بن سکتا ہے۔مترجم کے لئے ضروری ہے کہ

ا۔سب سے پہلے وہ اصل کے معنی اور مطلب(Sense) متن کے خیال کا بغور جائزہ لے۔

۲۔مترجم کے لئے دونوں زبانوں پر مکمل (Target Language)اور Source Language) (پر عبور رکھتا ہو۔

۳۔مترجم کو چاہیے کہ وہ روزمرہ کی زبان کو استعمال کرے۔

۴۔مترجم کو لفظی ترجمے سے گریز کرنا چاہیے(Word of Word Translation)

۵۔مترجم کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ درست آہنگ کے لئے مناسب الفاظ کا چناو کرے۔ Correct Tone)

Alexander Faser Tytlerنے اپنے ایک مضمون Essay on the Principles of) Translations میں لکھا ہے کہ

Translation ,That in Which the merit of the Orignal Work is so Compeletely Transfused in to Another Language ,as to be as distintly apprehended ,and as Strongly felt ,By a Native of the Country to which that Language belongs ,as it is by those who speak the language of the orignal work.

ٹائٹلر مزید بتاتے ہیں کہ ایک کامیاب ترجمے کے لئے تین نکات بہت اہم ہیں۔

1.Give a Compelete Transcript of the Ideas and Sentiments in the orignal passage .

2.Maintain the Charecter of the Style .

3.Have the Ease and Flow of the Orignal Text .

ا۔ترجمہ مکمل طور پر اصل متن کے خیالات اور جذبات کی نمائندگی کرتا ہو،جس کے لئے اسلوب کی خاصیت کا برقرار رہنا ضروری ہے،اصل متن کی عبارت جیسی روانی اور سلاست کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

کسی بھی ادبی تخلیق بالخصوص شاعری کے آزاد ترجمے نے فنِ ترجمہ نگاری میں بحث کو کئی جہتیں عطا کی ہیں،اور کئی طرح کے سوالات بھی ابھرے ہیں۔جن میں

ا۔تخلیق یا اصل متن(شاعری) کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا جائے کہ ترجمہ تخلیق کی بازآفرینی معلوم ہو۔

۲۔ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا جائے کہ اپنا ذاتی تجربہ معلوم ہو۔

۳۔اصل متن یا تخلیق کے مواد کے تخیل کے بل بوتے پر اپنی زبان میں منتقل کر دیا جائے۔یعنی تخلیق کے مفہوم کو اپنے Paraphraseالفاظ میں ترجمہ کیا جائے۔

شاعری کے ترجمے میں درپیش علمی مسائل کے حوالے سے ف۔س۔اؔعجاز لکھتے ہیں:

''دیگر زبانوں سے اردو شاعری کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے کچھ باتوں کا بطورِ خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔مثلا اصولِ ترجمہ،ترجمانی ،اسلوبِ ترجمہ (پابند یا غیر پابند) وغیرہ ۔ بلاشبہ شاعری کا ترجمہ ایک کٹھن راستہ ہے جسے عبور کرنے کے لئے ترجمے کے اصول کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔جبکہ صحیح ترجمانی کا فریضہ جیسے بنیادی نکات بھی وضاحت طلب ہیں۔اس تناظر میں جب ہم انگریزی میں فنِ ترجمہ نگاری کے اصول لسانیات کی رو سے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ترجمہ اور اس کا طریقہ کار سے متعلق انگریزی زبان میں کام لسانی بنیادوں پر زیادہ ہوا ہے۔اس لئے جب ہم انگریزی زبان میں ترجمے کے فن اور طریقہِ ہوئے ترجمے کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو اس ضمن میں انگریزی ادب میں کافی مواد مل جاتا ہے۔

پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی کے مطابق ترجمہ نگاری کے اصول کچھ اس طرح ہیں۔

مفہوم کی ترسیل:

کسی مصنف کی تحریر یعنی متن کے مفہوم کی ترسیل (Sourse Language)سے (Target Language) میں کرنا ،بغیر کسی ترمیم و اضافے کے منتقل کرنا نیز معنوی امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیش کرنا ہے۔

ہیئت:

بنیادی متن کے پیشِ نظر الفاظ اور محاوروں کی ترتیب اور درو بست قائم رہے۔لسانی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق کہیں کہیں الفاظ کی ترتیب،مترادفات اور ہیئت کے لحاظ سے معمولی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔کیونکہ ایک لفظ کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔

مصنف کا منشا اور عندیہ:

ترجمہ کرنے سے زیادہ غور وفکر اور سوچنے کا عمل ہے۔ترجمہ نگار،ترجمہ کرنے سے قبل مصنف کے عندیہ پر ضرور غور کرلے ورنہ یہ لفظی ءاور غیر فطری ترجمہ ہوکر رہ جائے گا۔مکمل ترجمہ وہی ہوگا جس میں مصنف کے اصل متن کا منشا واضح ہوجائے۔

بنیادی متن اور زبان:

ترجمے پر غیر فطری ہونے کا اعتراض رہا ہے۔بنیادی متن سے قطع نظر ان جملوں کا زبانی ترجمہ کیجئے ،اس سے خیالات کے اظہار کا فطری اسلوب جنم لیتا ہے۔

اسلوب اور شفافیت:

بنیادی متن کے اصول میں ترمیم نہیں کرنا چاہیے۔لیکن اگر کہیں کمی یا تکرار ہے تو اسے معمولی سی تصحیح کے ساتھ پورا

کردینا چاہیے۔محاورے وغیرہ کا استعماسل ترجمے کی گرفت سے باہر ہے،البتہ صنعتیں (Colloqal Dialect) اس میں شامل ہیں۔غیرمحاوراتی زبان ترجمے کے لئے مناسب ہے۔

2.3.3 ترجمے کے نظریات

ترجمہ،زمانہ قدیم ہی سے غور وخوص اور بحث کا موضوع رہا ہے۔گزشتہ پانچ ہزار سال میں خاطر خواہ بحث کے بعد چندنظریات قائم ہوئے۔

☆قدیم ویدک نظریہ: ترجمہ انتقالِ معنی کے ساتھ،انتقال مفہوم بھی ہے۔

☆نظریہ مطابقت: (Equivalent theory of Translation)ا

س نظریے کو 1960 میں پیش کیا گیا،(Otto Kade) اس نظریہ کا حامی تھا،اس کا مقصد یہ تھا کہ بنیادی متن لفظیات کو ترجمہ کی زبان کے متبادل لفظ فراہم کرنا، یہ متبادل الفاظ بنیادی متن کے مفہوم کی ترسیل کا حق ادا کرتے ہوں،جو لفظ کی ساخت سے قطع نظر معنی سے مطابقت رکھتے ہوں، یہ نظریہ انفرادی الفاظ کی سطح تک موجود تھا،جو (Automic Linguistics) تک محدود تھا لیکن جدید لسانیاتی ارتقا کے ساتھ لفظی مناسبت یا مطابقت یعنی Textual Equivalent سے ہٹ کر ساختی مناسبت Structural Equivalent کی جانب سے منتقل ہوتی گئی۔

ساختی ہیئت کی اصطلاح Filipel کی وضع کردہ ہے۔اور یہ نظریہ liepzig سکول کا پیش کردہ ہے۔اس لفظی متبادل کے بجائے پورے متن کے متبادل کو تلاش کرنے پر گفتگو کی ہے۔الفاظ کے متبادل تلاش کرنے کے بجائے پورے متن کے متبادل کو مجموعی طور پر فراہم کرنا چاہیے۔

☆باطنی ساخت کا نظریہ: (Internal Structural Theory)

باطنی ساخت کا نظریہ سارلینڈ یونیورسٹی ،سار بروکن (Saarlen University Saarbroken) جرمنی سے Wolfron Wilss کی کتاب Science of Translation Problem and Methods, شائع ہوئی۔اس کے ذریعے ترجمے کے جرمن نظریے کا انکشاف ہوا،یعنی معلومات کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا چاہیئے ، یہ نظریہ سائنسی نہیں بلکہ عینی تھا۔ Target Language میں منتقل کی جانے والی معلومات یعنی Sourse Language متن کی باطنی ساخت میں موجود ہوتی ہے۔ترجمہ نگار کو ان کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔یہ ترجمے کو بنیادی متن کی تخلیق کا درجہ دیتا ہے۔

☆ترجمہ کاری اسکول:سبکدست یا مکتبِ فکر:(Manipulation School)

تھیو ہرمنس نے اپنی کتاب (Manipulation of Litrature: Studies in Litrary Translation) میں لکھا ہے کہ ترجمہ ٹارگیٹ لینگویج میں خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل کرنا چاہیے۔آندرے

لیفیور (Andre Lefeuere) کا خیال ہے کہ ترجمہ بنیادی طور پر متن کو از سرِ نو تحریر کرنے کے مترادف ہے۔معاصر ماحول،لفظیات، کیفیات کے مدِ نظر نہایت خوش اسلوبی سے مکمل کرنے کی کوشش ہوتی ہے،جن کے ذریعے معنی ومقاصد کی تکمیل ہو سکے۔

☆نظریہ تمدن وترجمہ:

اتمار ایون ظہر (Itmar Even Zoher) تمدن سے متعلق نظریہ ساز ہے۔کثیر الجہت (Polysystem) نظریے کی بنیاد روسی ہیئت پرستی خصوصا (Tinjnov) کی ادبی تنقید کے نظام کے مراتب Hierachical Literary System کے تصور پر رکھی گئی ہے۔روسی ہیئت پرست اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تمدن ایک پیچیدہ ترین نظام ہے۔اس میں ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی شامل ہے۔مجموعی طور پر یہ اسکول اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ''کسی بھی متن کو معنی دراصل اس کا تمدن اور وہ اقدار عطا کرتے ہیں۔جو اس وقت رائج ہوں،جس زمانے میں وہ ترجمہ کیا گیا ہو۔''

ترجمے کی کوئی ایک مخصوص شکل نہیں ہوتی۔یعنی ترجمے کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے اور نہ کوئی ادیب یا فن کار،اسے کوئی معنی عطا کرتا ہے۔وہ اگر اس متن کے ذریعے کوئی معنی قاری تک پہچانے کی کوشش کرتا ہے تو بیکار ہے۔کیونکہ اس کے حتمی معنی تو وہ تمدن یا نظام،اقدار متیعن کرتے ہیں۔جو اس وقت رائج ہوں،اگر متن کئی معنوی سطح رکھتا ہے۔کسی بھی متن کا یہ کلی طور پر مفہوم ہوتا ہے اور ترجمہ کی مختلف قرات کے دوران جو تفہیماتی جہتیں سامنے آتی ہیں۔بعد کا ترجمہ بھی ناگزیر ہے،تب ہی مکمل ترجمہ ممکن ہے۔

☆ردِ تشکیل اور ترجمہ:

ژاک دریدا (Jaques Derrida) کے ردِ تشکیل کا نظریہ سوسیر کے نظریے سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔کیونکہ سوسیر زبان کو Sign System یعنی نظامِ نشانات قرار دیتا ہے۔اس کے خیال میں ہر نشان کے دو پہلو متعین ہیں۔ Signified اور دوسرا Signifier

Signifier آواز یا تصویر کی شکل میں ہوتا ہے،جبکہ Signified کے معنی کے تصور سے وابستہ یا معنی کی صورت میں ہوتا ہے۔۔ ہر نشان کو کوئی مخصوص معنی صرف اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ وہ دوسرے نشانات سے مختلف ہو یتا ہے مثلا Cat کے کوئی معنی نہیں ہیں،سوائے اس کے کہ وہ Rat یا Cap نہیں ہے۔بس یہی فرق لفظ کو معنی دیتا ہے۔سوسیر کے اس نظریے کی توسیع کرتے ہوئے دریدا اپنے خیال کو اس انداز میں ظاہر کرتا ہے کہ ''کسی زبان کے Signified کو پوری طرح دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ معنی کی بنیاد مستحکم نہیں ہے۔اس لئے ترجمہ سے قطع نظر ہمیں تبدیلی یا قلبِ ماہیت یعنی Transformation پر گفتگو کرنی چاہیے۔کیونکہ ترجمہ کی زبان ہمیشہ بنیادی متن Basic Text کو Modify کرتی ہے۔

والٹر بنجامن کا خیال ہے کہ ترجمہ نہ تو Source Oriented ہوتا ہے اور نہ Target Oriented بلکہ وہ اپنی طرح کا منفرد اسلوب ہوتا ہے اور ترجمہ چونکہ بنیادی متن کو دوسری جہت یعنی نئی زندگی دیتا ہے۔اس لئے یہ متن کے مابعد زندگی ہوتی ہے۔ جسے وہ After life سے منسوب کرتا ہے۔ بنجامن مزید کہتا ہے کہ ترجمے میں بنیادی متن وسیع ہوجاتا ہے۔

ژاک دریدا کا خیال ہے کہ ''متن کے اپنے کوئی مخصوص معنی نہیں ہوتے ،قاری اسے معنی عطا کرتا ہے۔اور مختلف معنی متعین بھی کرتا ہے۔'' یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قاری کسی متن کو پڑھ کر ہر بار مختلف معنی اور مفاہیم متعین کرے۔اس طرح مختلف قارئین ایک ہی ترجمے کو ہر مرتبہ مختلف انداز میں معانی کا تعین کریں۔اس طرح امکانات اور افہام وتفہیم کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ غالب ،اقبال، ٹیگور، شیکسپئر اور کالی داس کو متعدد بار پڑھنے کے بعد بھی بہت سے ایسے گوشے پردہ اخفا میں رہ جاتے ہیں۔جن کی تشریح اور تفہیم میں تشنگی کا احساس رہتا ہے۔

2.4 آپ نے کیا سیکھا

☆ اس اکائی میں آپ کو

☆ ترجمہ نگاری کی تعریف اور مفہوم سے کما حقہ معلومات فراہم ہوئی۔

☆ ترجمہ نگاری کے اصولوں سے متعلق تفصیلی معلومات کی جانکاری ہوئی۔

☆ مترجم کو درپیش مسائل اور ترجمے سے متعلق مختلف نظریات کی واقفیت حاصل ہوئی۔

☆ ترجمہ نگاری سے متعلق تشفی بخش انکشافات ہوئے۔

2.5 اپنا امتحان خود لیجئے

ا۔ترجمہ کی تعریف اور مفہوم کو تفصیلی بیان کیجئے ؟

۲۔ترجمہ نگاری سے متعلق کوئی دو نظریات کی وضاحت کیجئے ؟

2.6 سوالات کے جوابات

ا۔ پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی ترجمے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترجمہ دراصل متنی انکشاف کا ایسا تخلیقی عمل ہے جو Target Language اور Source Language کے ذریعے زبان وادب اور تہذیب وثقافت کو فروغ دیتا ہے۔ بلکہ اس سے زبان جو تہذیب کی بھی علامت ہوتی ہے اور قوموں کے جذبات واحساسات کا اظہار بھی ترجمے کے ذریعے اس قوم کی تاریخ وتمدن ،تہذیب ومعاشرت ، بودو باش علم و ہنر غرض کہ قصہ حیات کے ہر پہلو کے ساتھ لسانی خصوصیات ،فکر و فلسفہ،اور مدرکاتِ ترجمہ سے واقف ہوتے ہیں۔افہام وتفہیم ، نئے امکانات وا ہوجاتے ہیں۔''

ترجمہ اقوامِ عالم میں اختلاط کا نہایت عمدہ وسیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر تہذیب وتمدن میں تبادلہ کا پیش خیمہ بلکہ اس کی واحد عملی صورت ہے۔ یہ باہمی لین دین کا اٹوٹ سلسلہ ہے۔ جو ہمیشہ بنی نوع انسان کے لئے سود مند ثابت ہوا ہے۔مثال کے طور پر اگر مذہبیات میں ہم انجیل،قرآن اور وید،ادبیات میں الف لیلی ،رباعیاتِ عمر خیام ،حکایاتِ سعدی ،شیکسپئر اور ایسن کے ڈراموں اور فلسفہ کی سطح پر افلاطون ،ارسطو،اقبال،رومی،جنید بغدادی،شاعری میں،امیر خسرو،کالی داس،ٹیگور،اقبال،میر اور غالب سے روشناس نہ ہوتے ،تو ہم ان کی فکری اورتمدنی حیثیتوں سے محروم رہتے۔

مشاہدات کی ٹھوکریں قلم کی روح ہوتی ہیں۔سونا کامیوں کے تلخ ترین تجربات اور لاکھوں مطالعات سے کشیدہ ایک سطر مصنوعی ذہانت کی ہزاروں ویب سائٹ پر بھاری اور مفید ہوتی ہے۔نیز ایک ہزار سوشل میڈیائی تک بندی کتابیں تجرباتی تخلیق کے ایک صفحے کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے۔اس لئے کہ ترجمہ صرف متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش کرنا نہیں بلکہ ان افراد کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے جو دوسری زبان کو نہیں جانتے۔صاف ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے لئے غیر زبان کے مفاہیم کو ان کی اپنی زبان اور اسلوب میں بتانا پڑتا ہے۔اور یہ ایک اعتبار سے ''بازیافت'' کا عمل ہے۔

نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں اور قدیم وجدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں۔ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے۔اور اس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے جی کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے۔لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کی بدولت اور اس کی خاطر کئی اضافے کئے گئے ہیں۔ ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ ،اصطلاحات ،محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جو شروعات میں نامانوس ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ زبان پر رواں ہونے لگتے ہیں۔

ترجمے کے ذریعے علمِ انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے اور بہت طویل ہے۔اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔اگلے سرے پر بوعلی سینا،درمیان میں والٹیئر موجود ہے تو پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پستر ناک،عرب وعجم کے علمانے یونانی ،ہندوستانی فلسفہ،طب ،ہیئت ونجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کرکے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔لاطینی ورومی کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کردیا۔پھر زمانے نے کروٹ لی ۔والٹئر نے شیکسپیر کا ترجمہ کرکے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اور پستر ناک نے رومی مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔اس دوطرفہ عمل نے مشرق ومغرب کی طنابیں کھینچ دیں۔باہمی خیر خبر کی گنگا دوسمتوں میں بہنے لگی۔

۲۔☆نظریہ مطابقت: (Equivalent theory of Translation) اس نظریے کو 1960 میں

پیش کیا گیا،(Otto Kade) اس نظریہ کا حامی تھا،اس کا مقصد یہ تھا کہ بنیادی متن لفظیات کو ترجمہ کی زبان کے متبادل لفظ فراہم کرنا، یہ متبادل الفاظ بنیادی متن کے مفہوم کی ترسیل کا حق ادا کرتے ہوں، جو لفظ کی ساخت سے قطع نظر معنی سے مطابقت رکھتے ہوں ، یہ نظریہ انفرادی الفاظ کی سطح تک موجود تھا ، جو (Automic Linguistics) تک محدود تھا لیکن جدید لسانیاتی ارتقا کے ساتھ لفظی مناسبت یا مطابقت یعنی Textual Equivalent سے ہٹ کر ساختی مناسبت Structural Equivalent کی جانب سے منتقل ہوتی گئی۔ ساختی ہیئت کی اصطلاح Filipel کی وضع کردہ ہے۔اور یہ نظریہ liepzig سکول کا پیش کردہ ہے۔اس لفظی متبادل کے بجائے پورے متن کے متبادل کو تلاش کرنے پر گفتگو کی ہے۔الفاظ کے متبادل تلاش کرنے کے بجائے پورے متن کے متبادل کو مجموعی طور پر فراہم کرنا چاہیے۔

☆ باطنی ساخت کا نظریہ: (Internal Structural Theory)

باطنی ساخت کا نظریہ سارلینڈ یونیورسٹی ،سار بروکن (Saarlen University Saarbroken) جرمنی سے Wolfron Wilss کی کتاب Science of Translation Problem and Methods, شائع ہوئی۔اس کے ذریعے ترجمے کے جرمن نظریے کا انکشاف ہوا، یعنی معلومات کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا چاہیئے ، یہ نظریہ سائنسی نہیں بلکہ عینی تھا۔ Target Language میں منتقل کی جانے والی معلومات یعنی Sourse Language متن کی باطنی ساخت میں موجود ہوتی ہے۔ترجمہ نگار کو ان کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔ یہ ترجمے کو بنیادی متن کی تخلیق کا درجہ دیتا ہے۔

2.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
متن	کتاب کی اصل عبارت
فن پارہ	تحریر کا نمونہ
اسلوب	انداز، طریقہ تحریر، ترتیب
وجدان	کشف، الہام، غیبی یقین
ہم آہنگی	مطابقت
معنی آفرینی	معنی پیدا کرنا، مفہوم نکالنا
صراحت	صاف طور پر، وضاحت کے ساتھ
ترسیل	خبر رسانی
ابلاغ	اطلاع یا پیغام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہچانا

عروض وآہنگ　　　اوزانِ شعر کے جانچنے کا علم

2.8　کتب برائے مطالعہ

کتاب	مصنف	اشاعت	
۱۔فنِ ترجمہ نگاری	پروفیسر ظہورالدین	سیمانت پرکاشن دہلی	2006
۲۔فنِ ترجمہ نگاری	خلیق انجم	ثمر آفسیٹ، دہلی	1995
۳۔فکروتحقیق	مضمون نگار	سہ ماہی رسالہ، دہلی	2024

اکائی-3 نثری اور منظوم ترجمے

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 شاعری کا ترجمہ

3.4 اردو میں شعری ترجمے کی تفہیم وتنقید

3.5 نثر کا ترجمہ

3.6 نثری ترجمے کی اہمیت اور روایت

3.7 خلاصہ

3.8 آپ نے کیا سیکھا؟

3.9 اپنا امتحان خود لیجئے

3.10 فرہنگ

3.11 سوالات کے جوابات

3.12 کتب برائے مطالعہ

3.1۔اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ

1- ترجمہ کسے کہتے ہیں۔

2- شاعری کے ترجمے میں کیا دقتیں آتی ہیں۔

3- اردو میں شعری ترجمے کی تفہیم وتنقید کی صورت حال کیا ہے۔

4- نثری ترجمے کے امکانات کیا ہیں۔

5- نثری ترجمے کی اہمیت اور روایت کیا ہے۔

3.2 ۔ تمہید

ترجمے سے متعلق ابتدائی ناقدین میں سے کسی کی رائے ہے کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک دوسرے ناقد کا کہنا ہے کہ ''مترجم کا کام لفظ کی جگہ لفظ رکھنا نہیں بلکہ مصنف کے اسلوب اور زبان کی طاقت کو اپنی

زبان میں محفوظ کرنا ہے۔'' آگے چل کر اس قسم کی آرا میں ترمیم واضافہ بھی ہوتا رہا اور ردوقبول کا سلسلہ چلتا رہا۔ کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ ترجمے کا عمل ایک علمی یا ادبی مواد کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کا عمل ہے۔

دوسری زبانوں کی ادبیات سے ماخوذ ہونے کے سبب اس میں کچھ نہ کچھ غیریت کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں اسے طبع زاد ادب کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چیز شمار کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ طبع زاد اور ترجمے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جاتا ہے مثلاً ہم شیکسپیئر کا ڈراما پڑھیں اور پھر اس کا ترجمہ دیکھیں گے تو محسوس ہوگا کہ ترجمے کے دوران کچھ تبدیلی واقع ہو گئی ہے اور اس سے مفر بھی نہیں ہے خواہ ترجمہ کتنا ہی لائق وفائق ادیب کرے۔ حالانکہ مترجم کسی تحریر کو ایک اجنبی لباس پہناتا ہے۔ اس کی صورت کو بدلتا اور اسے ایک فنی روح مہیا کرتا ہے۔

اس طرح ترجمے کے تجزیاتی مطالعے میں اصل متن کے ساتھ کوئی متوازی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ البتہ ترجمے کے تکنیکی مسائل کا تجزیہ کرتے وقت تقابل اور تفاوت کو ضرور مدنظر رکھنا ہوگا۔ یہ تقابل اور تفاوت صرف ترجمے اور متن کے حوالے ہی سے نہیں ہوگا بلکہ ان مخصوص ادبی روایات کے حوالے بھی ہوگا جن سے متن اور ترجمے کا تعلق ہے۔ تخلیقی ادب کی عظمت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ کہنے سے تخلیقی ادب کی عظمت کم نہیں ہوتی کہ تخلیقی ادب کے بہت سے اعلیٰ نمونوں کے پیچھے ترجمے یا اخذ شدہ چیزوں کی چمک موجود ہے۔ چنانچہ کلاسیکی اردو نثر کا بہت سا سرمایہ تراجم یا اخذ شدہ تحریروں کے ذیل میں آتا ہے۔ ''باغ وبہار'' ہو یا ''بوستان خیال''، ''داستان امیر حمزہ'' ہو یا ''آرائش محفل''۔ غرض کہ ہمارا قابل قدر نثری سرمایہ اخذ یا ترجمے کی شکل میں ہے۔ البتہ اس وقت کی تہذیبی فضا میں ترجمہ کرنے والے کے لئے آزادی تھی کہ وہ قصہ بیان کرتے وقت بہت سی چیزوں کا اپنی طرف سے اضافہ بھی کر سکتا تھا۔ اسی لئے بہت سے ترجمے ماخوذ کے زمرے میں آجاتے تھے۔

3.3۔ شاعری کا ترجمہ

مظفر علی سید نے لفظ ''ترجمہ'' سے اچھی بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے معنی ہیں ''پار لے جانا۔'' اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ لفظ نقل مکانی سے نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے عربی زبان سے آیا ہے۔ اہل لغت اس کے کم سے کم چار معانی درج کرتے ہیں۔ ''ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام''۔ ''تفسیر وتعبیر''۔ ''دیباچہ اور کسی شخص کا بیان''۔ ''احوال'' یا ''تذکرہ شخصی۔''

(مرزا حامد بیگ، اردو ترجمہ کی روایت، ص، 45)

یہ سب معانی باہم مربوط ہیں لیکن یہ سب ثانوی اور مرادی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے کلاسیکی کارنامے ایسے ہیں جن کا بار بار ترجمہ ہوا ہے۔ کیونکہ کسی بھی ترجمے کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔ ان ترجموں کو بھی نہیں جن کو اپنے زمانے میں تخلیق تک سے بہتر کہا گیا ہو۔ شاعری کے ترجمے کی بات کریں تو بعض ناقدین کا خیال ہے کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسا کہ ڈاکٹر سیموئل جانسن شاعری کے ترجمے کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔ لیکن علمی سطح پر دیکھا جائے تو ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی نے ترجمے ہی کے ذریعے قدیم مشرقی شاعری کو مشرق و مغرب کی حال کی شاعری میں بدل دیا۔

مزید یہ کہ اب تک کی معلومات کے مطابق دنیا میں ترجمے کی ابتدا شاعری کے ترجمے سے ہی ہوئی۔ دنیا کا سب سے قدیم ترجمہ ہومر کی ''اوڈیسی'' کا یونانی زبان سے لاطینی زبان میں ہوا۔ یہ زمانہ قریب 250 قبل مسیح کا رہا ہوگا۔ ہومر کی اوڈیسی یونانی زبان میں رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ شاعری کا ترجمہ ایک مشکل مگر لطیف فن ہے۔ اگر مترجم میں استطاعت ہو تو مشکل ہونے کے باوجود ناممکن نہیں۔ شروع شروع میں کئی زبانیں یعنی عربی، فارسی اور ترکی جاننے والے شعرا نے ان زبانوں کی متعدد اصناف کو اردو میں ہو بہو اتار لیا۔ اور ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونے کا یہ سلسلہ کبھی ارادی اور کبھی غیر ارادی طور پر جاری رہا۔ عربی ترکی تو کم لیکن فارسی زبان کے تو بہت سے ایسے نمونے ہیں جو اردو زبان کا حصہ بنے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مرزا محمد رفیع سودا کا شعر ہے ؎

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے جبیں کو

یہ فارسی کے مشہور شاعر قدسی کے اس شعر کا ترجمہ ہے ؎

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد روتے زمیں را

سودا کا ایک اور شعر ؎

بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے
نسیم تیر سی، سینے کے پار گزرے ہے

یہ فارسی کے کسی استاد شاعر کے اس شعر کا ترجمہ ہے ؎

بہار بے سپر جام و یار می گذرد
نسیم ہمچوں خدنگ از کنار میں گذرد

ایسی مثالیں لاتعداد ہیں۔ ان میں سے کچھ کو ترجمہ نہیں بھی کیا جا سکتا اس میں تین چیزیں نظر آتی ہیں۔

پہلی سرقہ یعنی کچھ الفاظ کو بدل کر شعر کو چرالینا۔ دوسری توارد یعنی کسی ناپاک ارادے کے بغیر شعر کا دوسرے شاعر کے دل میں اتر آنا اور تیسری صورت ترجمہ ہے یعنی ایک زبان سے دوسری زبان میں بدل دینا اور اسی صورت کو سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

شاعری کے ترجمے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے۔ وہ ترجمہ کئے جانے والی زبان کے مزاج کے مطابق ہوجائے۔ مثال کے طور پر اردو کی بات کریں تو کسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جائے تو اسے اردو کے مزاج کے مطابق ڈھال لیا جائے راجہ بھرتری ہری کے شعر کا ترجمہ بہت سے لوگوں نے کیا ہے لیکن جب اقبال نے اس کا ترجمہ کیا تو وہ نہ صرف لوگوں کے دلوں میں اتر گیا بلکہ سابقہ تمام تراجم فراموش ہوگئے ۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اس شعر میں اقبال نے بھرتری ہری کے تمام تر مفہوم کو اپنی زبان کے مزاج اور ہیئت کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس وجہ سے وہ مقبول ہو سکا۔ پھول کی پتی، ہیرا، جگر، مرد ناداں، کلام نرم و نازک وغیرہ وہ الفاظ، اصطلاحات اور ترکیبات ہیں جو اردو والوں کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ جبکہ بھرتری ہری کے اصل شعر میں کہا گیا ہے کہ ''کسی مورکھ کو راہ راست پر لانا ایسا ہی ہے جیسے کہ سرسوں کی پتی سے مست ہاتھی کو روکنا۔'' سرسوں کی پتی، ہاتھی اور مورکھ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ہندی یا سنسکرت کے مزاج کے مطابق ہیں لیکن اردو کے لئے بے میل تھے۔ اس لئے شاعر نے انھیں اپنی زبان کے مطابق وضع کرلیا جس سے ترجمے کا نہ صرف حسن دوبالا ہوگیا بلکہ اس کے تاثر اور اثر پذیری میں بھی اضافہ ہوگیا۔

شاعری کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کا اصل کام نظم کی روح کو اپنی نظم میں منتقل کرلینا ہے۔ اقبال کے یہاں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے بہت سی انگریزی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا کہ وہ اصلاً اردو کی معلوم ہونے لگیں۔ ان نظموں میں ''ماں کا خواب''، ''ایک پرندہ اور جگنو'' قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے بہت سی انگریزی نظموں سے استفادہ کیا ہے جس میں بہت سی ترجمہ ہیں اور بہت سی ماخوذ۔ بہرحال یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے انگریزی نظموں کے لاثانی ترجمے کئے جن کی وجہ سے انگریزی ادب کا جو حصہ اردو ادب میں داخل ہوا وہ بیش بہا تھا، اس سے اردو شاعری دولت مند ہوئی۔

3.4۔ اردو میں شعری ترجمے کی تفہیم وتنقید

اردو میں شاعری کے ترجمے کی روایت کافی شاندار ہے۔ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اردو زبان کی انگریزی زبان سے قربت بڑھی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ اردو میں نظموں کے ترجمے کا ایک سلسلہ چل نکلا اور انگریزی علوم وادب سے آگاہی حاصل ہوئی۔

انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں سے ایک آدھ شعرا کے تراجم کا کچھ حصہ یہاں درج کیا جا رہا ہے تا کہ اندازہ ہو جائے کہ انگریزی نظموں کے جو ترجمے اردو میں ہوئے ان کا معیار کیا تھا۔ ترجمے کے فنی مباحث میں انھیں کس حد تک شامل کیا جا سکتا ہے۔

اگر چہ ترجمہ نگاری کے اپنے محدود اور مخصوص ضابطے ہیں یہ فن مترجم سے دو مختلف زبانوں پر یکساں عبور کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کی تہذیبی فضا سے واقفیت کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ منظوم فن پارے کے لئے تو مترجم میں ایک مخصوص تخلیقی قوت کی موجودگی بھی ضروری ہے کیوں کہ بقول ویلری: ''کسی نظم کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا واقعتاً اس کی تخلیقی بازیافت ہے۔'' (Paul Valery, Amolect (The Collected Works) editted by Jackson Mathews. Vol. 14, p. 48)

آیئے دیکھتے ہیں کہ اس تخلیقی بازیافت میں ہمارے شعرا کتنے کامیاب ہوئے ہیں۔

تھامس گرے کی ایک نظم ہے ''Elegy written in a country church yard'' یہ نظم 1751ء میں منظر عام پر آئی۔ اس نظم میں گرے نے ایک قبرستان کے ذکر کو مرکزیت دے کر ناسازگاریٔ حالات اور ناقدریٔ زمانہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار مخصوص طنزیہ انداز میں کیا ہے۔ اس نظم کا ترجمہ چار لوگوں نے کیا ہے جس میں علی حیدر نظم طباطبائی، سید احمد کبیر، امیر چند بہار اور سید صائب حسینی صائب نے مختلف سنین میں کیا۔ اس میں فنی نقطۂ نظر سے سب سے بہتر ترجمہ نظم طباطبائی کا تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے خیالات، فضا اور ہیئت کو قائم رکھا ہے۔ اس کا پہلا اسٹینزا ہے:

The curfew tolls the knell of parting day,
The lowing herd wind slowly o'er the lea,
The ploghman homeward plods his weary way,
And leaves the world to darkness and to me.

نظم طباطبائی نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

''جواہر منظوم'' میں قلق میرٹھی کی ایک نظم ہے ''حکایت پسر ناخدا'' یہ نظم Felicia Hemans کی نظم Casabianca کا اردو ترجمہ ہے۔ نظم کا پس منظر یہ ہے کہ 1798ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ جنگ میں فرانسیسیوں کا جہاز جل گیا اور جہاز کا ایڈمیرل انگریزوں کی گولہ باری میں مارا گیا۔ یہ دیکھ کر

جہاز کا عملہ بھاگ گیا۔لیکن مرنے والے کپتان کا بیٹا اپنے باپ کی لاش کے پاس کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ جہاز ڈوب گیا۔نظم کا پہلا بند اس طرح ہے:

The boy stood on the burning deck,
Whence all but he had fled;
The flamce that lit the battle's wreck,
Shone round him o'er the dead;

قلق میرٹھی نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

ایک جنگی جہاز میں جو آگ
لگ گئی آدمی گئے سب بھاگ
ناخدا کا رہا فقط لڑکا
تھم سا بالائے بام حجرہ کھڑا

قلق میرٹھی نے ان ہی چار مصرعوں میں ایک بات اضافی بیان کر دی ہے کہ وہ لڑکا ناخدا کا لڑکا تھا۔اس طرح قلق نے مزید توضیح کر دی ہے اور بات چار ہی مصرعوں میں مزید واضح ہوگئی ہے۔

ترجمے کے معاملے میں کبھی کبھی تو بھرتی کے الفاظ، تراکیب، بند بلکہ خیالات تک میں کاٹ چھانٹ کر کے ترجمے کو مؤثر بنایا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے یعنی جس نظم یا کسی اور شعری صنف کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کی مکمل ادائیگی کے لئے جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس میں الفاظ نہیں ہوتے۔اس لئے اس مفہوم کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا پڑتا ہے۔یا اصل زبان کے جملوں، تراکیب اور اصطلاحات کی تشریح کرنی پڑتی ہے۔اردو میں اس کی مثال اقبال کی انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی نظموں سے اکثر مل جاتی ہے۔

شعری ترجمے کے سلسلے میں عنوان چشتی کی یہ بات قابل لحاظ ہے کہ:

''اعلیٰ ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من وعن پیش کرتے ہیں۔اس میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ترجمے کو حذف واضافے سے پاک رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بلیغ اشاروں، حکیمانہ نکتوں، فلسفیانہ خیالات، جذبے کی رو اور تاثر کو پوری شادابی اور شدت کے ساتھ ترجمے میں سمویا جاتا ہے۔اس میں بنیادی خیال، جذبے یا فکر کے ساتھ زبان، تکنیک اور اسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی عناصر کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔اس طرح کا ایک کامیاب ترجمہ عظمت اللہ خاں کا ''ننھا غاصب'' ہے۔میریڈتھ (Meredith) کی نظم ''The Young Usurper'' (دی ینگ یزرپر) کا منظوم ترجمہ ہے۔''

(قمر رئیس، ترجمے کا فن اور روایت، عنوان چشتی، منظوم ترجمے، تاک پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1976ء)

مختصر یہ کہ اردو میں معیاری منظوم تراجم کی کمی نہیں ہے پھر بھی محمد حسن صاحب کی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا:

''ضرورت اکثر برائیوں کواچھائیوں میں بدل دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک برائی ترجمہ بھی ہے۔ Translator کو Traitor اور مترجم کو گندم نما جوفروش بھی کہا گیا ہے۔ ترجمہ اگر اصل کا کام دینے لگے تو ترجمہ کیوں کہلائے۔ لازمی طور پر یہ اصل سے کمتر ہوگا۔ اور جو کمتر ہو وہ برائیوں میں کیوں نہ گنا جائے۔ مگر ضرورت کہتی ہے کہ عالمگیر آگہی کا نور اور سرور ایک زبان کے دامن میں تو سمٹنے سے رہا۔ جب تک ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبان کے علم و آگہی، جذبے اور شعور، فکر واحساس، تکنیک اور سائنس تک پہنچنا چاہیں گے ترجمے کا سہارا لیں گے۔''

نتیجہ یہ کہ ترجمہ ایک ایسا فن ہے جو اپنی خامیوں کے باوجود اہم ہے اور خامیاں بھی ایسی جن پر کسی صورت قابو نہیں پایا جاسکتا۔

3.5۔ نثر کا ترجمہ

ترجمے کا مفہوم کسی خیال کو دوسروں تک منتقل کیا جانا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا آغاز انسانی تہذیب کی ابتدا سے ہی ہوتا آیا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جو کچھ سوچتا، سمجھتا یا تجربات سے حاصل کرتا ہے۔ وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے یا دوسروں کو اس میں شریک کرنا چاہتا ہے اور جب تک انھیں دوسروں تک پہنچا نہ لے اس کے اندر ابلاغ کی مسلسل خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہی خواہش ترجمے کی محرک ہے۔ اگر مخاطب ہم زبان نہیں ہے تو کسی مشترک زبان یا ذریعۂ اظہار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اردو میں لسانی سطح پر مترادفات سے ترجمے کا آغاز ہوا۔ ان مترادفات میں تصرفات بھی ہوئے۔ گویا اردو کے عناصر ترکیبی میں ترجمے کا خمیر شامل ہوا۔ جب زبان اظہار کے قابل ہوئی تو ہندوستان میں فارسی کا بول بالا تھا۔ عربی بھی مذہبی زبان تھی۔ لہٰذا کافی تعداد میں عربی اور فارسی سے نثری ادب کا ترجمہ اردو میں ہوا۔

اردو کے کلاسیکی عہد میں نثر کی، آرائش محفل اور انیسویں صدی کی دوسری بے شمار داستانیں ترجمہ ہی تصور کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ تراجم کس نوعیت کے ہیں اور کیا ان کے پیچھے کچھ اصول اور مقاصد بھی کارفرما رہے ہیں؟ مصنف نے اصل سے کہاں تک انصاف کیا ہے اور کہاں تک متن سے انحراف کیا ہے۔ یہ اگر آزاد تراجم ہیں تو مترجم کے ذہن میں آزادی کا کیا مفہوم ہے؟ ان تراجم نے اردو نثر کے اسالیب کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات قمر رئیس نے اٹھائے ہیں، جو بہت مناسب ہیں۔ ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

گو کہ انگریزوں نے سیاسی استحکام حاصل کرنے کے لئے اردو زبان کی سرپرستی کی لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزوں کے عہد میں اردو زبان فکری اعتبار سے توانا ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یورپی زبان وادب کے تراجم بھی تھے جو بڑے پیمانے پر کئے گئے اور اردو زبان اس سے مالا مال ہوئی۔ ادبی ترجموں کو اس سلسلے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ادبی ترجموں میں اگر صرف نثری ترجموں کی بات کی جائے تو صرف الف لیلہ کے ترجموں سے ہی اردو میں کہانیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا اور مغربی ناولوں اور افسانوں کے ترجموں نے تو اردو کے افسانوی ادب میں انقلاب ہی برپا کر دیا۔

نثری ترجمے کے سلسلے میں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ہم جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اس کے الفاظ ہمیں عزیز نہیں ہوتے، نہ ہمیں اس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ ہمیں الفاظ کے تلفظ اور نہ اس میں پوشیدہ موسیقیت سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ دلچسپی ہوتی تو اس میں موجود مفاہیم سے۔

دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے نثری تراجم خصوصاً علمی مواد کے تراجم میں الفاظ کی خوبصورتی اور زبان کی جمالیاتی اور فنی خوبیوں پر زور نہیں دیا جاتا۔ ترجمے کا عمل اس حالت میں صرف علمی اثاثے کی نشو نما میں حصہ لیتا ہے۔

اگر ہم ادبی نثری ترجموں کے حوالے سے بات کریں تو ادبی نثری ترجمہ الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے۔ ذہنوں کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ جس سے خیالات وجذبات کو بیان کرنے کے لئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں، نئے الفاظ بھی ہوتے ہیں۔ پرانے الفاظ کو استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں اور نئے علوم سے آشنائی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں نئی نئی اصناف سے ذہن کا تعارف ہوتا ہے اور فکر و تحقیق کے لئے نئے نئے سانچے اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں۔

یہاں ہمارا مقصد نثری ترجمے کی اس خوبی سے ہے جو ترجمہ کرنے سے کسی زبان میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے جملوں کی ساخت اس کی تشبیہیں اور استعارے، اس زبان کا سوز، یہ باتیں مل کر اثر قبول کرنے والی زبان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اور اسے وہ رنگ دیتی ہیں جو پہلے اس کے پاس نہیں ہوتا۔ مثال میں شاہ عبدالقادر کے قرآن کے ترجمے کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ترجمہ کرتے وقت انھوں نے عالمانہ زبان کو اپنے او پر حاوی نہیں ہونے دیا، انھوں نے ترجمے کے لئے ایسی زبان کا استعمال کیا جو لوگ بولتے تھے اور جس کے الفاظ غیر فہم نہ تھے۔ ایسے مواد کے ساتھ شاہ عبدالقادر نے اردو نثر کو جو اعتماد بخشا وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ لیکن سلاست اور بے ساختگی کی جو روایت اس ترجمے کے ذریعے قائم ہوئی تھی اس کو مناسب مقبولیت نہ ملی۔

3.6۔ نثری ترجمے کی اہمیت اور روایت

تہذیب انسانی کے ارتقا میں جہاں دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ ترجمے کا بھی بہت اہم رول رہا ہے۔ انسانی تہذیب کے ارتقائی مراحل میں ایک انسانی گروہ نے دوسرے گروہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ترجمے کی ایجاد کی۔اس سلسلے میں جو ابتدائی کوششیں ہوئی ہوں گی وہ نہایت مشکل مرحلے سے گزری ہوں گی۔

ترجمے کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ ایک زبان کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کر دیا جائے کہ اس میں الفاظ کا ایک پیٹرن بن جائے بلکہ ترجمہ اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔

ذرائع آمدورفت میں وسعت وسرعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط واختلاط بڑھتا جارہا ہے۔ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان سیکھنی پڑتی ہے اور ملوکیت میں وہ طبقے یا افراد ہمیشہ ممتاز رہتے ہیں جنھوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت حاصل کی۔ حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن واستحکام کے لئے محکوموں کی زبان اور ثقافت سے بھی آشنائی ضروری ہے۔اس چیز نے بھی نثری ترجموں کو کافی فروغ دیا۔

دوسری زبان سے براہ راست استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ہمیشہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔لہٰذا ترجمے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔علم کی وسعت اور علمی وسائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کے لئے نثری ترجمے کی اہمیت وضرورت ہمیشہ قائم رہے گی۔ترجمہ وہ کنجی ہے جس سے علوم وفنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں۔لہٰذا اس کی اہمیت نہ صرف قائم رہے گی بلکہ روز بروز بڑھتی جائے گی۔

ترجمے کے سلسلے میں خصوصاً نثری ترجمے کے سلسلے میں پہلی مشکل اصطلاح کے سلسلے میں آتی ہے۔یہ مشکل سائنسی اصطلاح کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔کیوں کہ ہر اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے اور اس کے لئے ایسا متبادل لفظ ہونا چاہئے جو وہی مخصوص معنی دیتا ہو۔

اسی طرح قوانین کی کتابوں یا عدالت کے فیصلوں کے ترجموں کے لئے بھی مخصوص اور معین معنی دینے والے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترجمے کے ذریعے علم انسانی میں اضافہ کرنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ظ۔انصاری لکھتے ہیں:

''اگلے سرے پر بوعلی سینا اور درمیان میں والٹیر موجود ہیں تو پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پسترناک عرب وعجم کے علما یونانی ہندوستانی،فلسفہ،طب،ہیئت ونجوم اور داستانوں کا عربی ترجمہ کرکے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔لاطینی ورومی کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک تحقیقات سے باخبر کردیا۔پھر زمانے نے کروٹ لی۔والٹیر نے شیکسپیئر کا ترجمہ کر

کے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اضافہ کیا.....علمائے مستشرقین کے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔'' (ظ۔ انصاری، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ ترجمے کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6، ص،77)

اردو میں جدید سائنسی علوم وفنون پر تصانیف کا آغاز 1591ء سے اور ادبیات سے متعلق انگریزوں سے تراجم کے آغاز کا سراغ 1734ء سے ملتا ہے۔ جبکہ سائنسی علوم سے متعلق تصنیف وتراجم کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہوتا ہے 1834ء میں نواب شمس الامرا ثانی نے حیدرآباد دکن میں سائنسی کتب کی تالیف وترجمہ کے کام کا آغاز کیا۔ (مرزا حامد بیگ، مغرب کے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1988ء)

اس دوران بہت سی سوسائٹیوں اور انجمنوں کا قیام عمل میں آیا جو اردو ترجمے پر کافی زور دیتی تھیں۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی غازی پور نے جدید علوم وفنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مغربی ادبیات کو اردو میں منتقل کرنے کا کام دوسروں کی بہ نسبت زیادہ کیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں خالص علمی وتحقیقی ادارے قائم ہونا شروع ہوئے۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد، ترقی اردو بورڈ (حال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) نئی دہلی وغیرہ ایسے ادارے ہیں جنھوں نے تصنیف وتالیف وترجمے کا کام خالصتاً علمی اور تحقیقی بنیادوں پر کر کے ایک معیار قائم کیا۔

3.7۔ خلاصہ

ترجمے کی بنیادی شرط یہ تسلیم کی جاتی ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرنا ہو اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو، مترجم کو دونوں پر مکمل قدرت حاصل ہونی چاہئے۔ اور وہ بھی صرف اس حد تک نہیں کہ دونوں کے مطالب سمجھ میں آجائیں بلکہ ان کی ساخت، مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر سے بھی اچھی آگاہی ہو۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شعری ترجمہ ہو یا نثری، ترجمہ الفاظ کا نہیں بلکہ مفہوم کا کیا جاتا ہے۔

ترجمہ اپنے آپ میں ایک فن ہے اور اس سے علم وفن میں خصوصاً شعری ادب کے ترجموں میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ واصطلاحات، محاورات اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اول اول کھرے معلوم ہوتے ہیں رفتہ رفتہ زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ کہیں کہیں اصل تصنیف کے الفاظ و عبارت کو اس کے خاص لہجے کو ترجمے میں برقرار رکھنے کی کوشش میں یہ اضافہ خود بخود ہو جاتا ہے۔

زیادہ تر ادبیات خصوصاً شعری ادب اپنے اندر ایک جمالیاتی عنصر رکھتا ہے اور بقول محمد حسن صاحب اس کے ترجمے کا عمل الفاظ کے سطحی معنوں کے بجائے ان کے متعلقات کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔ الفاظ صرف معلومات یا تصورات ہی پیش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں۔ شعری تراجم میں جمالیاتی عنصر کو بھی

اتار لینا نہایت مشکل ہوتا ہے اور جس مترجم نے اس حق کو ادا کر دیا تو سمجھئے کہ ترجمے کا حق ادا کر دیا۔

ماہرین کے مطابق ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔شعری ادب کا ترجمہ کچھ زیادہ ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نہ صرف زبان پر کامل عبور ہونا چاہئے بلکہ دونوں زبانوں زبانوں کا تاریخی ارتقا، دونوں زبانوں کے سیاسی وسماجی عوامل، زبانوں میں رونما ہونے والی تحریکات کو سمجھنا بھی ضروری ہے تب ہی ترجمہ نگاری کا حق ادا ہوگا۔

ترجمہ نہ صرف ایک فن ہے بلکہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، اس زبان کی توسیع اور فروغ میں معاونت کرتا ہے۔ترجمہ خواہ شعری ادب کا ہو یا نثری ادب کا۔مترجم ترجمہ کرنے کے دوران اصل متن میں موجود محاورات، تشبیہ اور استعارات کو اپنے طور پر دوسری زبان میں داخل کرنے کے لئے نئی نئی اصطلاحات کے نادر و نایاب نمونوں کو ترجمہ کی جانے والی زبان میں منتقل کر کے بیش بہا خزانہ اسے عطا کر دیتا ہے۔

3.8۔ آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے ذریعے ہم نے:

1- ترجمے کی اصلیت و ماہیت سے آگاہی حاصل کی۔

2- شاعری کے ترجمے میں آنے والی دشواریوں سے واقفیت حاصل کی۔

3- اردو شعری ترجمے کی دشواریوں کو مثالوں سے سمجھا۔

4- نثری ترجمے کے امکانات کی جانکاری حاصل کی۔

5- نثری ترجمے کی اہمیت اور روایت پر نظر ڈالی۔

3.9۔ اپنا امتحان خود لیجئے

1- اہل لغت ترجمے کے کتنے معنی درج کرتے ہیں؟

2- ہومر کی ''اوڈیسی'' کا ترجمہ کس زبان سے کس زبان میں ہوا؟

3- منظوم فن پارے کے لئے مترجم میں کس مخصوص قوت کی موجودگی ضروری ہے؟

4- شاعری کا ترجمہ کرنا مشکل ہے یا نثر کا؟

5- نثری ترجمہ کرتے وقت پہلی مشکل کیا آتی ہے؟

3.10۔ فرہنگ

الفاظ	معنی
ناقد	تنقید کرنے والا
اخذ	لے لینا

ماخوذ	لے لینا، لیا ہوا
پیکر	جسم
طبع زاد	اپنی ایجاد یا اختراع
تقابل	مقابلہ یا موازنہ کرنا
تفاوت	فرق
نقل مکانی	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا
تفسیر	تشریح، وضاحت
تعبیر	بیان کرنا، عبارت میں لانا
مربوط	جڑا ہوا
توارد	دو شخصوں کو ایک ہی مضمون سوجھنا
اثر پذیری	اثر ہونا
بازیافت	پھر سے حاصل کرنا
آگہی	جانکاری
مترادفات	دو ایسے لفظ جن کے معنی ایک ہی ہوں
تصرفات	اپنی طرف سے کچھ شامل کر دینا
انحراف	پھر جانا، برخلاف ہونا، انکار
ارتباط	میل جول، ملاپ، دوستی
اختلاط	ربط ضبط، میل جول
متعلقات	متعلقہ کی جمع، وہ چیزیں جو کسی دوسری چیز سے تعلق رکھیں

3.11۔ سوالات کے جوابات

1- اہل لغت ترجمے کے چار معنی درج کرتے ہیں۔

2- یونانی سے لاطینی میں۔

3- تخلیقی قوت کی۔

4- شاعری کا ترجمہ کرنا زیادہ مشکل ہے۔

5- اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی مشکل۔

3.12۔ کتب برائے مطالعہ

1- قمر رئیس، ترجمے کا فن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1976ء

2- خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، سر سید بک ڈپو، علی گڑھ، 1990ء

3- اعجاز راہی (مرتب)، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1994ء

4- نثار احمد قریشی، ترجمہ روایت اور فن، اسلام آباد، 1985ء

5- مرزا حامد بیگ، مغرب کے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1988

بلاک2 :

اکائی4-اردو میں علمی،فنی وادبی تراجم کی اہمیت وروایت

اکائی5-اردو میں دفتری وقانونی تراجم کی اہمیت وروایت

اکائی6-اردو میں صحافتی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل

اکائی7-اردو میں سائنسی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل

اکائی8-اردو میں مذہبی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل

اکائی9-اصطلاح سازی کے اصول ومسائل اور مخطوطات کے تراجم

اکائی10-اردو ترجمے کے ممتاز ادارے (ابتدا تا حال)

اکائی11-عالمی سطح پر ترجمے کی روایت اور آفاقیت (اردو کے ابتدائی تراجم)

اکائی12:اردو میں مفہومیاتی(semantic)،ترسیلی(Communicative)،متنی تراجم (Textual Translation) اور حکائی ترجمے کی روایت (Oral Tradition of Translation)اہمیت اوراطلاق

اکائی 13: مترجم (Translator)، ترجمہ کار (Translation) کا فرق نقل ترجمہ (Translitreation)اورانفرادی نوعیت کے تراجم

اکائی14:اردو ترجمہ کے اقسام،لسانی مسائل اورامتیازات

بلاک2 کا تعارف

اکائی 4 ''اردو میں علمی، فنی وادبی تراجم کی اہمیت و روایت'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں غالب کی غزلوں کا فکری وفنی جائزہ لیتے ہوئے ان کی خصوصیت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 5 ''اردو میں دفتری و قانونی تراجم کی اہمیت و روایت'' پر مبنی ہے۔ اس میں قصیدہ گوئی کے حوالے سے غالب کی شعری خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی 6 میں''اردو میں صحافتی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل'' پر گفتگو کی گئی ہے۔اس میں غالب کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 7 ''اردو میں سائنسی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں خطوط غالب کی خصوصیات اور ان کی انفرادیت وار دوادب میں خطوط غالب کی اہمیت وافادیت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 8 ''اردو میں مذہبی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں غالب کے فارسی خطوط کے مجموعے 'دستنبو' کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز تاریخ غدر میں ان خطوط کی دستاویزی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 9 ''اصطلاح سازی کے اصول ومسائل اور مخطوطات کے تراجم'' پر مبنی ہے۔اس میں بحیثیت مورخ غالب کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔غالب کی غزلوں اور نثری نگارشات میں تاریخ کے جو نکات ملتے ہیں ان کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 10 ''اردو ترجمے کے ممتاز ادارے (ابتدا تا حال)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں غالب کی غزلوں کو آغا محمد باقر کی شرح 'بیان غالب' کے توسط سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ساتھ ہی شارح بیان غالب کے کی تشریحات کے آئینے میں غالب کی غزلوں اور ان کے فن پر گفتگو کی گئی ہے۔

اکائی 11 ''عالمی سطح پر ترجمے کی روایت اور آفاقیت (اردو کے ابتدائی تراجم)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں مشہور ادیب و ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'تفہیم غالب' جس میں غالب کی منتخب غزلوں کی تشریح شامل ہے،اس کے حوالے سے غالب کی فکری وفنی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اکائی 12 ''اردو میں مفہومیاتی (semantic)، ترسیلی (Communicative)، متنی تراجم (Textual Translation) اور حکائی ترجمے کی روایت (Oral Tradition of Translation) اہمیت

اوراطلاق‘‘ کےعنوان سےقائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں شامل نصاب غالب کی غزلوں کی شرح کرتے ہوئے ان کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔جس کے طلبا کو غالب کی غزلوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اکائی 13: ’’مترجم (Translator)، ترجمہ کار (Translation) کا فرق نقل ترجمہ (Translitreation) اور انفرادی نوعیت کے تراجم‘‘ کےعنوان سےقائم کی گئی ہے۔

اکائی14: ’’اردو ترجمہ کے اقسام،لسانی مسائل اورامتیازات‘‘ پرمبنی ہے۔

اکائی 4 اردو میں علمی، فنی اور ادبی تراجم کی اہمیت و روایت

ساخت

4.1 تمہید

4.2 اغراض و مقاصد

4.3 اردو میں علمی، فنی اور ادبی تراجم کی اہمیت

4.3.1 اردو میں ترجمے کی روایت

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

4.6 سوالات کے جوابات

4.7 فرہنگ

4.8 کتب برائے مطالعہ

4.1 تمہید

ترجمہ نہایت پیچیدہ تخلیقی عمل ہے۔ترجمے کی یہ تعریف یقیناً اس کی قدیم تعریفوں کے منافی ہے کیونکہ ترجمے کو محض نقالی اور مفہوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا قرار دیا جاتا رہا ہے۔ذہنی مزدوری اور میکانکی عمل سمجھا جانے والا فن پیچیدہ تخلیقی عمل تو درکنار تخلیقی عمل سے بھی کوسوں دور خیال کیا جاتا رہا ہے۔ترجمے کی مختلف تعریفوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم ترجمے کے مقام، اہمیت اور روایت کو دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

4.2 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

☆اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ترجمے کی اہمیت اور افادیت سے واقف ہوں گے۔

☆ ادبی تراجم کی روایت سے آگاہی حاصل کریں گے۔

4.3 اردو میں علمی، فنی اور ادبی تراجم کی اہمیت

انگریزی میں ترجمہ کا ہم پلہ لفظ Translation ہے۔جس کا اردو مفہوم ’’پار لے جانا‘‘ کا ہے۔گویا مترجم خیال و معنی کو ایک زبان کے کنارے سے دوسری زبان کے کنارے تک لے جاتا ہے۔معانی و مفاہیم کو دور

لے جانے کا یہ عمل مصنف کے اسلوب اور لسانی خلاقی کو دوسری زبان میں پار لے جاتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ترجمہ ایک زبان کی راکھ سے دوسری زبان کو حیات بخشنے کا عمل ہے۔ کسی فن پارہ کے ترجمہ یا قابلِ ترجمہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فن پارہ اپنے نقلِ مفاہیم کی کامیابی سے قطع نظر، زندگی پا جائے گا۔ لیکن اصل متن کی زبان یا ماخذ زبان دراصل اپنے ذائقے کو دوسری زبان میں نہیں دکھا پائے گی۔ اور یوں اس زبان کی حلاوت اور اسلوب کی متنوع جہات ترجمہ کرنے والی زبان میں راہ نہیں پا سکیں گی۔ یا پھر نئے زبان کے پیکر میں یوں ڈھل جائیں گی کہ اصل زبان کی موت واقع ہو جائے گی۔ سوسن بیسنٹ لکھتی ہیں:

''دلیل دی جاتی ہے کہ ترجمہ کسی متن کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ ترجمہ موثر طور پر کسی متن کی حیات بعد از ممات اور ایک دوسری زبان میں ایک نیا ''اصل'' بن جاتا ہے۔

مرزا حامد بیگ فنِ ترجمہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک برتن سے دوسرے برتن میں انڈیلنا ایک پرانی شراب کو نئی بوتل فراہم کرنا ہے۔''

اس نئی بوتل میں پرانی بوتل کہ شباہت، جسامت اور سائز کی عکاسی کس حد تک ضروری ہے، یہی ترجمے کی مشکلات ہیں۔ مگر اتنا تو طئے ہے کہ اس بوتل کا ہر ممکن تک شفاف ہونا ضروری ہے۔ تا کہ انڈیلی گئی شراب کا اصل رنگ و روپ نظر آئے۔ ترجمہ تخلیقی عمل سے کم نہیں کیونکہ جب افسانوی متن کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو ترجمہ محض ایک زبان سے دوسری زبان میں متن کو منتقل کرنے ہی کا نام نہیں بلکہ متون اور ثقافتوں کے درمیان مذاکرات کا عمل ہے ۔ایک ایسا عمل جس میں ہر طرح کی منتقلی کے ثالث کے فرائض مترجم سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ محض خطِ راست میں کیا گیا عمل نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت عمل ہے جس میں یہ خیال بھی رکھنا پڑتا ہیکہ اصل متن سے کیا کچھ کامیابی سے منتقل ہوا اور یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کیا کچھ منتقل نہیں ہو پایا۔ چنانچہ ترجمہ محض اصل مصنف اور متن سے وفاداری اور ہم پلہ الفاظ کی فراہمی ہی نہیں ہے بلکہ ترجمہ شدہ متون کی اہمیت جدت اور تنوع میں ان کے کردار کا ازسرِ نو جائزہ بھی ہے۔

چناچہ ترجمے کی اہمیت اور ضرورت ہر دور سے زیادہ ہوگئی ہے یہ دور Globalisation کا دور ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگ سفر کی سہولتیں کم ہونے نیز مزاج میں مقامیت اور قناعت کے عناصر زیادہ ہونے کی وجہ سے شاذ ہی سفر کیا کرتے تھے، سفر خصوصی ضرورت یا افتادِ طبع کی بدولت کیا جاتا تھا لیکن موجودہ دور کو مہاجرت کا عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ رزق کی تلاش ان دیکھی دنیا کی کشش، باہمی انحصاریت کی بنیاد پر ایک ملک سے دوسرے ملک جانا اب ایک عام سی بات ہے۔ ترجمہ بھی دراصل مہاجرت کا عمل ہے۔ جس میں مقامی ملکی زبان کے کچھ عناصر تو منتقل ہو جاتے ہیں مگر مقامی مٹی کی بو باس اور ذائقہ منتقل نہیں ہو پاتا۔ سرحد پار لوگوں کی نقل مکانی ترجمے کے اسلوب کو بڑھا رہی ہے۔ دنیا کو ایک گلوب، ایک وحدت کی شکل میں دیکھا جائے تو علم بھی کسی ایک قوم کی میراث

نہیں ٹہرتا۔ چناچہ اکیسویں صدی میں مترجم کی حیثیت بھی تبدیل ہوگئی ہے۔ کیونکہ فن ترجمہ محض خیال یا فکر کی ترجمانی نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ اب ترجمے میں مترجم کی موجودگی اور اس کے تخلیقی شعور کی عکاسی ضروری ہے۔

آندرے لیفیور اور لارنس وینوٹی نے ترجمے کو ثقافتی اور تاریخی تناظر میں اہمیت دی۔ اور اس کے مختلف جہات کو دریافت کرنا شروع کیا۔ چناچہ ان کے مطابق ترجمہ ایک زبان کے الفاظ کو ڈی کوڈ کر کے انہیں دوسری زبان میں دوبارہ encode کرتا ہے۔نئی لسانی تشریحات کے مطابق زبان Signifiers کا ایک مربوط نظام ہے۔ چناچہ ترجمہ ایک زبان کے Signifiers کو دوسری زبان کے Signifiers سے بدلتا ہے۔ اور مترجم ایک آزاد کاربن جاتا ہے۔

☆ترجمے کی اہمیت:

نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں، اور قدیم وجدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں۔ یہ عمل تاریخی تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارے لئے سب سے اہم ذریعہ ہے، جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ ترجمہ کے ہی ذریعے ایک مخصوص ملک اور جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات اور اس کے علوم وفنون کے تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے ترجمے کی ذمہ داری کم سے کم اتنی اہم ہے جتنی کسی کیمیائی یا معدنی قوت کو ایک روپ سے دوسرے روپ میں ڈھالنے کی ہوتی ہے۔ تیل کوئلے اور سونے کی کانیں جب تک زمین کے سینے میں دبی رہیں، اس وقت وہ قومی دولت نہیں سمجھی جاتی، لیکن جب اس ذخیرے کو ایک جگہ سے دوسرے جگہ منتقل کیا جانے لگے تو یہی عمل دولت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے، اور یہ دولت تمام عالمِ انسانی کی مجموعی دولت میں اضافہ کر دیتی ہے۔

سقراط ''وی مقراطیس'' اور افلاطون کے دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئیں تھیں، اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انہیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کے آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے تو بوعلی سینا، ابن رشید، ابونصر فارابی کے کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے۔ اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انہیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ و فلسفے کے اگلے ورق کے لئے محفوظ نہ کر لیا ہوتا۔

ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے۔ اور اس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے جس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کے بدولت اور اس کی خاطر اکثر اضافے کئے گئے ہیں۔ ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ واصطلاحات، محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اول اول کھرے معلوم ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ زبانوں پر رواں ہونے لگتے ہیں۔ کہیں اصل تصنیف کے الفاظ وعبارت کو اس کے خاص لہجے میں

برقرار رکھنے کی کوشش، کے باعث یہ اضافہ خود بہ خود ہو جاتا ہے۔اور اسی طرح ترجمے کی راہ سے زبان کی لغت اور طرزِ ادا میں نئے شگوفے پھوٹتے ہیں، نئے استعارے نمودار ہو جاتے ہیں، جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ترجمے کے ذریعے علمِ انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے۔اور بہت طویل ہے۔اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔اگلے سرے پر بوعلی سینا، درمیان میں والٹیر موجود ہیں، پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پستر ناگ۔عرب وعجم کے علما نے یونانی، ہندوستانی فلسفہ، طب، ہیئت ونجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کرکے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔لاطینی ورومی کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کر دیا۔پھر زمانے نے کروٹ لی، والٹر نے شیکسپیئر کا ترجمہ کرکے فرانسیسی زبان کے ذریعے اور پستر ناگ نے روسی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کئے۔خود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔علمائے مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کروایا۔اس دوطرفہ عمل نے مشرق ومغرب کے طنابیں کھینچ دیں۔باہمی خیر خبر کی گنگا دونوں سمتوں میں بہنے لگی۔ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔

جاگیرداری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جا بجا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علم وفنون کے ترجمے کرانے کے لئے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے جاتے تھے۔زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا سرکاری سطح پر انتظام کیا جاتا تھا۔ترجمے کے کامیاب مخطوطے شاہانہ تحفوں اور ہدیوں میں بھیجے جاتے تھے۔اشوکِ اعظم کے پاٹلی پتر میں بنی عباس کے بغداد میں، بنو فاطمہ کے قاہرہ اور اسکندریہ میں، عہدِ اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارالترجمے ملتے ہیں۔پھر ان مقامات سے جو ترجمے نکلے، ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا۔جن میں وہ ترجمے کئے گئے تھے، نہایت ہی قریبی مثال کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کے ذریعے دور دراز کی زبانوں سے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں۔چھوٹی چھوٹی دھاروں کے پاٹ چوڑے کئے گئے ہیں۔اور ان سے زیادہ گہرائی اور روانی پیدا کی ہے۔

اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کے بدولت، ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی۔اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طئے کر لینے میں ترجمے کا بڑا ہاتھ ہے۔کہیں یہ ترجمہ کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال۔استعارے اور اصطلاحوں کی صورت میں! بہر حال یہ مسلمہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاوں کے ترجمے اور ترجمانی کو اردو زبان کی تعمیر وتربیت میں بڑا دخل ہے۔

لیکن چونکہ ہماری زبان کو منظّم علمی ولسانی کام کا ایک پرسکون زمانہ نصیب نہیں ہوا اور با اقتدار طبقے کی سرپرستی میں پروان چڑھنے کی عمر طبعی اسے نہیں ملی۔اس لئے ترجمے میں خاص طور سے غیر ذمہ داری برتی گئی

ہے۔کہیں کہیں غیر زبانوں کا دخلِ بے جا بھی ہوگیا ہے۔اور ایسے ترجمے ہوئے ہیں جو زبان کو عوام سے قریب لانے کے بجائے اسے اور دور لے جاتے ہیں۔ترجموں کو نا قابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔

احتساب بڑی اہم چیز ہے،خاص طور سے زبان و ادب کے معاملے میں، کیونکہ وہ میدان ہے جہاں بے اعتدالی کرنے پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوتی،ادب کے لئے سوطریقے احتساب کے مقرر ہیں۔علمِ معانی،علمِ بیان ،عروض یہ سب پیمانے ہیں اوران پیمانوں سے ناپ ناپ کر نثر و نظم کو دیکھا جاتا ہے۔پھر تنقید کے ذریعے احتساب ہوتا ہے، پھراس کے بعد تنقیدی اصول ہیں جو تنقید کا بھی احتساب کرتے ہیں لیکن ترجمہ اگر کامیاب ہو تو بجائے خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔اس کا احتساب کا کوئی اصول واضح نہیں کیا گیا ہے۔اور نہ ایسے پیمانے بنا کر ترجمہ کرنے والوں کے سامنے رکھے گئے، جو احتساب کے کام آسکے۔یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں سے قطع نظر خاص طور سے ہماری زبان میں ایسے ترجموں کی کوئی کمی نہیں، جو زبان و ادب میں اضافہ کرنے کے بجائے اسے اور نقصان پہچاتے ہیں۔لب و لہجے پر اثر ڈالتے ہیں۔اصل تصنیف کی طرف رغبت پیدا کرنے کے بجائے اس سے نفرت دلاتے ہیں اور اردو کے مزاج کو راس نہیں آتے۔

آج جب دنیا کی طنابیں کھینچ رہی ہیں اور عالم گیر سطح ایک اکائی بنتی جارہی ہے،کوئی زبان بھی ترجمے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔کہ جب تک نئے خیال کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ و روپے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب کا تجزیہ کرنے سے اس زبان کی معاشی،معاشرتی،ذہنی اور فکری ارتقا کا بڑی حد تک پتہ چلتا ہے۔زبانیں ایک معاشرتی قوت اور فہم وعقل کے عمیق مہاساگر،لغت و معنی اور علم و ادب،تخیلات اور اظہار و ابلاغ کے ایک خزانے کی مانند ہوتی ہیں۔دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان بھی مسلسل متحرک اور ماڈرن رجحانات کی طرف گامزن ہے۔

علم و ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ادب انسانی ذات کی تہذیب و ثقافت کی علامت اور ذہانت رہا ہے۔اور ادب کا مقصد بھی یہی ہے۔ترجمہ ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں۔ترجمے کی اہمیت وضرورت کے ساتھ ہم اس کے اہم مدارج کی صورتوں پر غور کریں گے۔بنیادی طور پر ترجمے کی دو قسمیں تسلیم کی گئی ہیں۔

۱۔ موضوعاتی

۲۔ہئیتی یا فنی تراجم

موضوعاتی تراجم کے ذیل میں:(۱)علمی ترجمہ (۲)ادبی ترجمہ (۳) صحافتی ترجمہ

ہئیتی یا فنی تراجم کے ذیل میں:(۱)لفظی ترجمہ (۲)آزاد ترجمہ

☆تخلیقی ترجمے: (علمی اورادبی ترجمہ)

☆غیرتخلیقی ترجمے: (صحافتی ترجمہ)

تخلیقی ترجمے سے مراد ادبی اور تخلیقی تحریروں کے تراجم ہیں۔اورانہی پرسب سے زیادہ اختلافی باتیں ہوتی ہیں۔کیونکہ سائنس یاعلمی موضوعات کا ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحوں پراختلاف ہوسکتا ہے۔لیکن مفہوم کی ترسیل میں فرق نہیں پڑتا۔جبکہ ادبی ترجموں میں اصل جھگڑااس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ اعتراض کیا جائے کہ لکھنے والے کا اصل مفہوم یا تحریر کا مزاج تو ترجمے میں آیا ہی نہیں۔پھر اصناف کی باریک بینیاں بھی اکثر ترجمے میں حائل ہوجاتی ہیں مثال کے طور پر نظم کے برعکس غزل کا ترجمہ مشکل ہے۔غزل کے خیال کو تو آسانی سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے مزاجی کیفیت اور ہئیتی دبازت کو ترجمہ کرنا آسان نہیں۔

غیرتخلیقی تراجم جن میں فلسفہ،صحافت،نفسیات اور دوسرے علوم شامل ہیں۔محنت کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی معیار بندی کا تقاضہ بھی کرتے ہیں کہ ان میں اگر چہ زبان اورفن کی نزاکتوں کا زیادہ خیال نہیں رکھنا پڑتا لیکن مفہوم کی صحت بہت اہم ہوتی ہے۔بقول جیلانی کامران''غیرادبی تصانیف کا ترجمہ دراصل ایک زبان کی لسانی موت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری زبان کی لسانی افزائش کا باعث بنتا ہے۔''یہ بات درست ہے کہ اس طرح کے ترجمے میں ہم ایک زبان کے مقابلے میں دوسری زبان میں اضافہ کررہے ہوتے ہیں،اس قسم کے سائنسی یا علمی ترجمے میں زبان اور اسلوب کی نزاکتوں کے بجائے مفہوم سے دلچسپی ہوتی ہے۔ایسے ترجموں میں اصل مشکل اصطلاحوں کا وضع کرنا ہے اور یہ کام انفرادی سے زیادہ اجتماعی بلکہ ایک ایسے مجاز ادارے کا ہے جو اصطلاحوں کی مجموعی معیار بندی کے ساتھ ساتھ مفہوم کی صحت کا بھی خیال رکھے۔

ترجمے تین قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ادبی(تخلیقی)تراجم

۲۔علمی(سائنسی)تراجم

۳۔صحافتی (غیرتخلیقی)ترجم

☆ ادبی تراجم اور کی چند مثالیں:

ادبی ترجمے کے تحت افسانوی اور غیرافسانوی تراجم آتے ہیں جیسے داستان،ناول،افسانہ،ڈرامہ،مکالمہ ،خطوط،انشائیہ،روداد نگاری،رپورتاژ نگاری،سوانح،خاکہ نگاری،خودنوشت اور دیگر۔جبکہ شاعری میں اس کے تمام اصناف شامل ہیں۔

ابتدا میں اصول موجود نہیں تھے۔اس طرح کے ترجمے Interpration کی نوعیت کے ہوتے تھے۔مثلاً باغ و بہار،روضۃ الشہدا،دریائے لطافت،گورِغریباں وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔لیکن اصولوں

سے قطع نظر زبان کی پختگی ، اظہار کا بیانیہ، تاریخی اور معنیاتی زبان خاصے کی چیز ہے۔ بعض فلسفیانہ تحریریں جن کا مفہوم عام مترجم کے ذہن میں نہیں اتر پاتا اس طرح کی تحریروں کا ترجمہ مبہم اور ذو معنویت سے آلودہ تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً Manu scriptology کا ترجمہ ذخیرہ مخطوطات، بین السطور (Gap Between Line) (بین المتونیت کا ترجمہ متن کے سطور کے درمیان فاصلہ وغیرہ۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ تخلیق ازخود ایک قسم کا ترجمہ ہے۔ یعنی جو کچھ ہم سوچتے ہیں، ہمارے افکار، تخلیقی کرب کا س اظہار اسی زبان میں کرتا ہے۔ جس زبان میں وہ مہارت رکھتا ہے۔ تخلیق کار کی ایک شکل مترجم کی بھی ہوتی ہے، اس اصل تخلیق کا کسی دوسری زبان میں کوئی دوسرا ترجمہ کرتا ہے تو اسے Approximation کی منزل کہا جا سکتا ہے۔

تخلیقی ترجمہ کرنے والوں میں میر امن، ملا وجہی، ڈاکٹر ذاکر حسین، رتن ناتھ سرشار، نظم طباطبائی سعادت حسن منٹو، مولوی کریم الدین، اختر حسین رائے پوری، عابد حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد سلیم الرحمٰن، محمد عمر میمن، ۔۔۔۔۔ مشتاق بھٹی، یوسف حسین خان، عزیز احمد، پروفیسر ضیا الرحمٰن صدیقیک ے ساتھ ساتھ کئی اور اہم نام قابل ذکر ہیں۔

علمی اور فنی تراجم کی چند مثالیں:

علمی ترجمے کے ذیل میں سائنسی اور سماجی علوم شامل ہیں۔ جبکہ سائنسی علوم وفنون اور ٹکنالوجیکل تراجم میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ جس کسی لفظ یا اصطلاح کا ترجمہ ایک جگہ کیا جاتا ہے وہ ان معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے، جس سے ترجمہ شدہ متن میں یکسانیت قائم رہے۔

کتاب	ترجمہ نگار
تاریخ ہندوستان	سر سید احمد خان
اسبابِ بغاوتِ ہند	سر سید احمد خان
دون کا سبزہ	ضیاالرحمٰن صدیقی
تلاشِ حق	سید عابد حسین
ہیون سانگ کا سفرِ ہندوستان	ضیاالرحمٰن صدیقی
روسی افسانے	پروفیسر محمد مجیب
بنگالی کہانیاں	ضیاالرحمٰن صدیقی
میکسم گورکی کے افسانے	سعادت حسن منٹو
طبقات الشعرا	مولوی کریم الدین
خطباتِ گارساں دتاسی	یوسف حسین خان، اختر حسین رائے پوری

☆**فنی تراجم:**

ترجمہ ایک ایسا فنی عمل ہے جس کی تعریف کلی طور پر بیان نہیں کی جاسکتی۔انگریزی میں اردو شاعری کا ترجمہ کرتے وقت ردیف کے استعمال کی دقت پیش آتی ہے۔رالف رسل نے خورشیدالاسلام کے اشتراک سے غالب کی چند غزلوں کا ترجمہ (Selected Lyrics Letters) نام سے انگریزی میں کیا تھا۔اس میں 104 غزلیں شامل ہیں۔رسل کا خیال ہے کہ اس میں ردیف کی ضرورت نہیں۔

شاعری میں علم کی دو اقسام سے کام لیا جاتا ہے۔'اکتسابی' خارجی وسائل کے ذریعے فراہم کردہ معلومات ،روایتی پس منظر اور سابقہ معلومات وغیرہ ،دوسری قسم وہی ہے یعنی ودیعت کردہ علم کے ذریعے جو تمام معلومات کا جوہر ہے۔اس ضمن میں شیلے کا مضمون ''شاعری کا جواز'' اور سی۔ڈے۔لیوس کی کتاب A hope for Poetry کا ترجمہ اہم ہے۔

☆**فنی تراجم کے اقسام:**

لفظی ترجمہ:

لفظی ترجمے کے تحت صرف مذہبی یا قانون سے متعلق کتابوں اور تحریروں کو شامل کیا جاتا ہے۔اس نوع کی کتابوں میں ترجمہ نگار کو اپنے جانب سے کسی طرح کی ردوقبول کی اجازت نہیں ہوتی۔اگر کسی لفظ کا بدل نہیں ملتا تو اسی زبان میں اس لفظ کو ویسے ہی رکھ دیا جاتا ہے اور اس لفظ کے حواشی میں وضاحت کردی جاتی ہے۔

آزاد ترجمہ:

علمی وادبی تراجم میں تشریح اور تفہیم کی گنجائش ہوتی ہے۔لیکن اصل مصنف یا تخلیق کار کے عندیے کو ذہن میں رکھتے ہوئے مافی الضمیر بیان کرنا لازمی ہے تاکہ اس فن پارہ کی تاثیر باقی رہے۔

4.3.1 اردو میں ترجمے کی روایت

ترجمہ کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان کی سماجی زندگی۔جب ایک سماجی گروہ کا دوسرے گروہ سے سماجی رشتہ قائم ہونے پر ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لئے ترجمے کا سہارا لینا پڑا ہوگا،تو ترجمہ کچھ آوازوں اور کچھ اشاروں پر مبنی ہوگا۔حملہ آوروں ،سفیروں اور سیاحوں وغیرہ کی بنیادی ضرورت یہ تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنی بات سمجھا سکیں۔اس سے پہلے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے قابل ہوتے ،کسی ترجمان کے ذریعے انہوں نے ایک دوسرے تک اپنی بات پہچائی ہوگی۔قدیم ہندوستان کے غیر معمولی ترقی یافتہ تہذیب کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں ترجمے کا عام رواج ہوگا۔

یہاں ہم اپنی بات مغل عہد سے شروع کررہے ہیں۔مغلوں کے عہد میں سرکاری ضرورتوں سے مختلف

زبانوں سے فارسی میں اور فارسی سے ان زبانوں میں لازمی طور پر ترجمے ہوتے ہوں گے۔لیکن مغل بادشاہوں نے ہندوستانی ادب کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔عہدِ اکبری میں ایسے ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی، جو فارسی سے بخوبی واقف تھے۔اکبر کو سنسکرت سے بہت لگاؤ تھا۔اس نے سنسکرت سے شاعری، فلسفہ، ریاضی، الجبرا وغیرہ کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ملاعبدالقادر بدایونی نے 1574 میں ''سنگھاسن بتیسی'' کا ''خردِافروز'' کے نام سے ترجمہ کرایا۔1575 میں بدایونی نے بھاون نامی ایک پنڈت سے ''اتھروید'' کا فارسی میں ترجمہ شروع کروایا، لیکن یہ کام پورا نہ ہوسکا۔شیخ فیضی اور حاجی ابراہیم تھانسیری نے یہ کام مکمل کرنے کی کوشش کی۔لیکن یہ دونوں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ملا بدایوں نے ''رامائن'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔پھر انہوں نے ''تاریخِ کشمیر'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔اکبر ہی کے عہد میں کئی علما نے مل کر'مہابھارت' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔اسی زمانے میں ''لیلاوتی''،''نل دمن''اور''ہری بنس''وغیرہ کے ترجمے تیار ہوئے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ترجموں کی تیاری میں برہمن اور مسلمان عالم دونوں برابر کے شریک تھے۔

ترجمے کا کام صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا۔دوسری ہجری کے وسط میں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔770 ہجری میں سندھ سے ایک وفد'خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں گیا تھا۔اس وفد میں ایک ایسے پنڈت بھی شامل تھے جو ہیئت اور ریاضیات کے ماہر تھے۔انہوں نے اپنے ساتھ ہیئت کی مشہور کتاب ''سدھانت'' لے گئے تھے۔خلیفہ کو جب اس کتاب کی مندراجات کا علم ہوا تو اس نے اپنے دربار کے ایک ریاضی داں ابراہیم فراضی کو حکم دیا کہ وہ اس کا عربی میں ترجمہ کرے۔بغداد کے دو عالم اور ماہر ہیئت ابراہیم فراضی اور یعقوب بن طارق پنڈت کے شاگرد ہوگئے۔ان دونوں شاگردوں نے اپنے اپنے طریقے سے ''سدھانت'' کی بنیادی اصولوں کو عربی میں منتقل کیا۔ہیئت کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں ایک ''کلیلہ و دمنہ'' اور دوسری ''بوزاسف و بلوہر''۔ کلیلہ و دمنہ یہ پنچ تنتر کا ترجمہ ہے، کہا جاتا ہے کہ عربی میں ان دونوں کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کی بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں عربی سے ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

اردو ادب کے ابتدائی عہد میں بہت بڑی تعداد میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے اردو نثر میں ترجمے کئے گئے۔یہ ترجمے مذہب، تصوف، شاعری، داستان، ہیئت اور فلسفے کی کتابوں کے تھے۔بعض محققین کا خیال ہے کہ شاہ میراجی نے ابوالفضائل، عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیداتِ ہمدانی'' کا عربی سے اردو میں جو اردو ترجمہ کیا تھا وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔بعض حضرات کا خیال ہے کہ ملا وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف ''دستورِ عشاق'' کا اردو میں ''سب رس'' کے نام سے ترجمہ کیا۔1704 میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف''''معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

اٹھارویں صدی کے اوائل میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہوا۔تقریباً اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں کربل کتھا کے نام سے ترجمہ کیا۔

ان ترجموں کے بارے میں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ یہ ترجمے نہیں بلکہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمہ ہوتے تھے۔ان میں ترجمہ نگاری کے ان سائنٹیفک اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی جو اچھے ترجموں کے لئے ضروری ہے۔

عیسائیوں نے جب ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے قدم رکھا تو ان کے مبلغین نے اپنی مذہبی کتابیں ترجمہ اور تالیف کر کے شائع کیں۔اٹھارویں صدی کے وسط میں انھوں نے توریت اور انجیل کے اردو ترجمے شائع کئے۔کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی کتاب،کتاب پیدائش کے پہلے چار بابوں کا ترجمہ ہندوستانی ہے۔جس کا ترجمہ Benjamaain Schultze نے کیا تھا۔اس کے بعد شولٹز نے کتاب دانیال کا اردو جمہ شائع کیا۔ان تمام کتابوں کی فہرست سی۔اے گیریرسن نے اپنی کتاب ''ہندوستان کا لسانی ترجمہ'' جلد نہم میں دی ہے۔

اردو میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ مولانا شاہ رفیع نے کیا۔یہ ترجمہ لفظی تھا۔یعنی قرآن شریف کے ہر لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا۔یہ ترجمہ پہلے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ سلیس،شگفتہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا تھا۔

☆فورٹ ولیم کالج:

اب تک اردو میں جتنے تراجم ہوئے تھے۔وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔فورٹ ولیم کالج پہلا ادارہ تھا۔جس نے منظّم اور باقاعدہ طریقے پر عربی،فارسی اور سنسکرت سے سے اردو میں ترجمے کئے۔اس کالج میں ہندوستانی زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا۔اس شعبے کے لئے گل کرسٹ کو پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔کالج کے نصاب میں شامل کرنے کے لئے ساٹھ کتابیں تیار کی گئیں۔ان میں تراجم بھی تھے تالیف اور تصنیفات بھی۔تراجم میں پابند ترجمے بھی تھے اور آزاد ترجمے بھی۔فورٹ ولیم کالج میں جن ادیبوں نے اردو میں ترجمے کئے ان کے نام ہیں۔عبداللہ مسکین،کاظم علی جوان،بہادر علی حسینی،مظہر علی خان ولا،شیر علی افسوس،حیدر بخش حیدری،خلیل علی خان اشک،طوطا رام،میر جعفر،مولوی عنایت اللہ،غلام اکبر،وغیرہ۔

☆دہلی کالج:

فورٹ ولیم کالج کے تراجم دہلی کالج کے تراجم سے بالکل مختلف تھے۔فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لئے تراجم کئے گئے تھے۔جبکہ دہلی کالج میں ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دینے کے لئے بڑے پیمانے

پر ترجمے کئے گئے۔

☆دارالترجمہ عثمانیہ:

نظام حیدرآباد نے 1917 میں شعبہ تالیف وترجمے کے نام سے دارالترجمہ قائم کیا۔اس ادارے میں آرٹس کے تمام مضامین میں ایک ایک اور سائنس کے مضامین میں دو دو مترجمین کا تقرر کیا گیا۔ یہ مترجمین انگریزی،عربی ،فارسی اوراردو پر قدرت رکھتے تھے۔ان میں قاضی محمد حسین ،تلمذ حسین ،محمد الیاس برنی ،نظم طباطبائی ،سید ہاشمی فرید آبادی ،سید علی رضا ،عبدالحلیم شرر ،وحید الدین سلیم ،مولوی عنایت اللہ ،پروفیسر ضیا الدین انصاری وغیرہ شامل تھے۔اس ادارے نے کئی کتابیں ترجمہ کروائیں لیکن افسوس کہ حیدرآباد کے الحاق کے وقت پولیس ایکشن میں دارالترجمے کوآگ لگادی گئی۔

سائنٹیفک سوسائٹی،دارالترجمہ حیدرآباد،انجمن ترقی اردو،ساہتیہ اردو اکاڈمی ،اردوکونسل جیسے اداروں نے ترجمہ نگاری کے کام میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

آپ نے اس اکائی میں

☆ترجمہ میں علمی،فنی اورادبی ترجمہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی۔

☆ترجمہ کی روایت کے بارے میں آپ نے واقفیت حاصل کی۔

4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ترجمے کی اہمیت کے بارے میں لکھیے؟

نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں،اور قدیم وجدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں۔ یہ عمل تاریخی تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارے لئے سب سے اہم ذریعہ ہے،جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ترجمہ کے ہی ذریعے ایک مخصوص ملک اور جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات اور اس کے علوم و فنون کے تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں۔اس لحاظ سے ترجمے کی ذمہ داری کم سے کم اتنی اہم ہے جتنی کسی کیمیائی یا معدنی قوت کوایک روپ سے دوسرے روپ میں ڈھالنے کی ہوتی ہے۔تیل کوئلے اور سونے کی کانیں جب تک زمین کے سینے میں دبی رہیں ،اس وقت وہ قومی دولت نہیں سمجھی جاتی ،لیکن جب اس ذخیرے کوایک جگہ سے دوسرے جگہ منتقل کیا جانے لگے تو یہی عمل دولت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے،اور یہ دولت تمام عالم انسانی کی مجموعی دولت میں اضافہ کردیتی ہے۔

سقراط''وی مقراطیس'' اور افلاطون کے دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے قدیم

کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئیں تھیں، اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انہیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کے آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے تو بوعلی سینا، ابن رشید، ابونصر فارابی کے کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے۔ اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انہیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ و فلسفے کے اگلے ورق کے لئے محفوظ نہ کر لیا ہوتا۔

ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے۔ اور اس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے جس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کے بدولت اور اس کی خاطر اکثر اضافے کئے گئے ہیں۔ ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ و اصطلاحات، محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اول اول کھرے معلوم ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ زبانوں پر رواں ہونے لگتے ہیں۔ کہیں اصل تصنیف کے الفاظ و عبارت کو اس کے خاص لہجے میں برقرار رکھنے کی کوشش، کے باعث یہ اضافہ خود

بہ خود ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح ترجمے کی راہ سے زبان کی لغت اور طرزِ ادا میں نئے شگوفے پھوٹتے ہیں، نئے استعارے نمودار ہو جاتے ہیں، جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ترجمے کے ذریعے علمِ انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے۔ اور بہت طویل ہے۔ اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔ اگلے سرے پر بوعلی سینا، درمیان میں الٹر موجود ہیں، پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پستر ناگ۔ عرب و عجم کے علما نے یونانی، ہندوستانی فلسفہ، طب، ہیئت و نجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کر کے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔ لاطینی و رومی کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کر دیا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی، والٹر نے شیکسپیئر کا ترجمہ کر کے فرانسیسی زبان کے ذریعے اور پستر ناگ نے روسی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کئے۔ خود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ علمائے مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کروایا۔ اس دوطرفہ عمل نے مشرق و مغرب کے طنابیں کھینچ دیں۔ باہمی خیر خبر کی گنگا دونوں سمتوں میں بہنے لگی۔ ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔

جاگیرداری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جا بجا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علم وفنون کے ترجمے کرانے کے لئے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا سرکاری سطح پر انتظام کیا جاتا تھا۔ ترجمے کے کامیاب مخطوطے شاہانہ تحفوں اور ہدیوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اشوکِ اعظم کے پاٹلی پتر میں بنی عباس کے بغداد میں، بنو فاطمہ کے قاہرہ اور اسکندریہ میں، عہدِ اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارلترجمے ملتے ہیں۔ پھر ان مقامات سے جو ترجمے نکلے، ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا۔ جن میں وہ ترجمے کئے گئے تھے، نہایت ہی قریبی مثال کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں

کے ذریعے دور دراز کی زبانوں سے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دھاروں کے پاٹ چوڑے کئے گئے ہیں۔ اوران سے زیادہ گہرائی اورروانی پیدا کی ہے۔

4.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔کتاب	مصنف	اشاعت	
ا۔فنِ ترجمہ نگاری	پروفیسر ظہورالدین	سیمانت پرکاشن دہلی	2006
۲۔فنِ ترجمہ نگاری	خلیق انجم	ثمر آفسیٹ، دہلی	1995
۳۔فکروتحقیق	مضمون نگار	سہ ماہی رسالہ، دہلی	2024

اکائی 05 اردو میں دفتری وقانونی تراجم کی روایت اور اہمیت

ساخت :

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 ترجمے کا مفہوم

5.4 اردو میں دفتری وقانونی ترجمے کی اہمیت

5.5 اردو میں دفتری وقانونی ترجمے کی روایت

5.6 آپ نے کیا سیکھا

5.7 اپنا امتحان خود لیجیے

5.8 سوالات کے جوابات

5.9 فرہنگ

5.10 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبا:

- طلبہ کو دفتری وقانونی ترجمے کے فنسے واقف ہوسکیں گے
- دفتری وقانونی ترجمے کی اہمیت سے روشناس ہوسکیں گے
- دفتری وقانونی ترجمے کی تاریخ سے متعارف ہوسکیں گے
- دفتری وقانونی ترجمے کے مسائل سے واقف ہوسکیں گے

- دفتری وقانونی ترجمے کی ضرورت اور طریقۂ کار سے واقفیت بہم پہنچاسکیں گے
- دفتری وقانونی ترجمہ کرنے کی لیاقت پیدا کرسکیں گے

5.2 تمہید

گزشتہ اسباق میں آپ نے ترجمہ کے فن اوراس کی اہمیت اور اردو میں ترجمے کی روایت سے متعلق تفصیلات کا مطالعہ کیا ہے۔ترجمے کا میدان بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔تحریری ترجمہ نگاری سے پہلے زبانی ترجمانی کاایک دورگزرچکاہےاورآج بھی یہ کسی نہ کسی صورت رائج ہے۔تحریری ترجمے کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔اس کی بھی کئی قسمیں ہیں جن میں ’دفتری اورقانونی تراجم‘ اپنی بعض ترجیحات کے سبب نہایت اہم اورضروری تصور کیے جاتے ہیں۔آئندہ اوراق میں ہم ترجمہ کی اسی خاص قسم ’دفتری اورقانونی ترجمے‘ کے رموز ونکات اوران کی باریکیوں کے ساتھ ساتھ اردو میں اس کے آغاز وارتقا کے بارے میں پڑھیں گے۔

5.3 دفتری وقانونی ترجمے کا مفہوم

دفتری اور قانونی ترجمہ سے مراد کسی بھی زبان میں موجودقانونی دستاویزات، وثیقہ جات،عدالتی احکامات،قانونی معاہدے،حلف نامے اور عدالتی کارروائیوں کا ترجمہ ہے۔اب اس میں مختلف کمپنیوں اور اداروں کی پالیسیوں اورحکم ناموں کوبھی شامل کرلیا گیا ہے۔یعنی ہر وہ کاغذ جس کاتعلق ادارے یا تنظیم کے انتظام و انصرام سے ہواسے قانونی اور دفتری وثیقہ قرار دیا جاتا ہے۔ایسی تمام تحریروں کا ترجمہ ’دفتری اورقانونی ترجمہ‘ کے زمرے میں شامل ہے۔

مترجمین اور ناقدین فن کا خیال ہے کہ ترجمہ کی تمام اقسام میں دفتری وقانونی تراجم کی قسم سب سے نازک اورمشکل ہے۔یہ فن دقت طلبی کے ساتھ وسیع مطالعے اورتجربے کا تقاضا کرتا ہے۔اسے محض زبان دانی اور لغات کے وسیلے سے کماحقہ انجام نہیں دیا جاسکتا۔قانون اور دفتر کی زبان کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ان کا سیاق اورتناظرا الگ ہوتا ہے۔اس پرعمل کرنے والے افرادمختلف لسانی اورتہذیبی پس منظر رکھتے ہیں۔ان تمام باریکیوں کوملحوظ خاطر رکھے بغیر دفتری اورقانونی دستاویزات کا ترجمہ ممکن نہیں۔مترجم کے لیےضروری ہے کہ وہ اصل زبان اورترجمے کی زبان سے بخوبی واقف ہو۔قانونی تراجم کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں لفظ کی بہت اہمیت ہوتی ہے کیونکہ لفظ کی تبدیلی سے قانون کامفہوم بدل جاتا ہے۔اس لیےاس سیاق میں یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ قانونی تراجم لفظی ترجمے پرمبنی ہوں تاکہ کسی قسم کاانتشاراورغلط فہمی کاامکان نہ رہے۔

دنیا کے تمام قانون کی زبان میں چند خصوصیات ایسی ہیں جنھیں مشترکہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

باریکی اور گہرائی: آئین اور دستور کی زبان تہہ دار ہوتی ہے۔ اس کے ہر لفظ میں ایک جہان معنی آباد آباد ہوتا ہے۔ ہر مسئلے کے بیان میں الفاظ کا انتخاب بہت باریکی اور گہرائی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

سادگی اور سلاست: کسی بھی قانون میں مستعمل الفاظ سادہ، بے تکلف، سلیس اور برجستہ ہوتے ہیں اور مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

توضیحی رویہ: قانون کی زبان کے لیے یہ لازمی تصور کیا جاتا ہے کہ اس کی زبان واضح اور صاف ستھری ہوتا کہ کسی قسم کا اشتباہ یا ابہام کی گنجائش نہ رہے۔

اس لیے قانونی اور دفتری زبان کے مترجم کو چند امور کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً:

لفظی ترجمہ: اگر اصل زبان میں موجود اصطلاح کے لیے ترجمے والی زبان میں متبادل اصطلاح موجود ہوتو مترجم کو چاہیے کہ اسے ہی استعمال کرے اور حتی الامکان لفظی ترجمے کی راہ پر چلے۔

توضیحی رویہ: اگر اصل زبان میں موجود اصطلاح کے لیے ترجمے والی زبان میں موزوں متبادل موجود نہ ہوتو مترجم اجتہاد سے اصطلاح وضع کرسکتا ہے لیکن ایسی صورت میں اس کی وضاحت ضروری ہے۔

حاشیہ آرائی: اگر اصل زبان میں موجود اصطلاح کے لیے ترجمے والی زبان میں موزوں متبادل نہ ہوتو عبارت من و عن نقل کردی جائے اور اس کی تشریح وتوضیح حاشیے میں کردی جائے۔

ان باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دفتری اور قانونی تراجم نہ صرف مشکل عمل ہے بلکہ نہایت ذمہ داری اور حد درجہ نزاکت کا متقاضی ہے۔

5.4 دفتری وقانونی ترجمے کی اہمیت

انسان ایک سماجی نظام کے تابع ہے اسی لیے اسی سماجی حیوان بھی کہا جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ اصول و ضوابط کا پابند ہوتا ہے۔ یہ اصول وضوبط وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل بھی ہوتے ہیں اور بعض ضروریات کے پیش نظر سماج کے نمائندے اس میں خود بھی ترمیم و اضافہ کرتے ہیں۔ جب یہی اصول وضوبط تحریری طور پر پیش کیے گئے تو بعض افراد اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کی سہولت کی خاطر ان اصول وقوانین کا ترجمہ ان کی زبان میں

کیا گیا تا کہ وہ اسے سمجھ سکیں اور ان کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔ اگر ترجمہ کی سہولت نہ ہوتو بہت سے افراد قانون اور اصول وضوابط کی سہولت سے محروم رہ جائیں گے اور انھیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوگا۔

پوری دنیا میں انتظام وانصرام اور نظم ونسق قائم رکھنے کے لیے طرح طرح کے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ یہ قوانین کسی ایک زبان میں وضع کیے جاتے ہیں لیکن ان کا اطلاق ایک بڑی آبادی پہ ہوتا ہے جو اس زبان سے کما حقہ واقف نہیں ہوتی۔ ان کی سہولت اور بعض اوقات بیداری کے مدنظر ان قوانین کے تراجم مقامی زبانوں میں کیے جاتے ہیں تاکہ ان اصول وضوابط سے سبھی آگاہ ہوسکیں۔ انسانی زندگی کی ترقی اور معاشرے کی خوش حالی و بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ قانون علم ہر شخص کو ہو۔ ہمارا معاشرہ ابھی خواندگی اور علم کے معاملے میں ایک حد تک ہی ترقی کر سکا ہے۔ وہ بھی دفتری زبان عموماً ایسی ہوتی ہے جسے عوام کی اکثریت سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اسے سادہ اور عام فہم نیز مقامی زبان میں پیش کرنا مترجم کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے دفتری اور قانونی ترجمے کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

5.5 دفتری وقانونی ترجمے کی روایت

اردو میں دفتری اور قانونی تراجم کا آغاز کب ہوا یہ قطعی طور پر نہیں بتایا جا سکتا لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کے آغاز کے ساتھ ہی اس میں ترجمے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ جو قانونی اور انتظامی اصطلاحیں لائے وہ فارسی، عربی اور ترکی زبانوں سے ماخوذ تھیں۔ اس سے پہلے ہندوستان کی مقامی زبانوں میں بھی انتظامیہ سے متعلق اصطلاحیں موجود تھیں۔ مسلم حکمرانوں نے ان اصطلاحوں سے بھی خوب استفادہ کیا۔ مختلف اوقات میں غوری، ترک، خلجی، لودھی اور مغل حکمرانوں کے بعد انگریزوں نے بھی عربی، فارسی، ترکی اور مقامی ہندوستانی کے ساتھ انگریزی کی بعض اصطلاحوں کو استعمال کیا جس کی وجہ سے دفتری اور قانونی تراجم کی راہیں ہموار ہونے لگیں اور انتظامیہ سے متعلق بہت سی اصطلاحیں اردو میں در آئیں۔

اردو میں دفتری و قانونی تراجم کا باضابطہ آغاز اس وقت ہوا جب 1837 میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ فارسی کو دفتری اور قومی زبان کا درجہ دینا درست نہیں کیونکہ عوام کی اکثریت اس سے نابلد ہے، اس کی جگہ اردو کو یہ مرتبہ دیا جانا چاہیے۔ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی نے فارسی کو بے دخل کر کے انگریزی کو نصاب کا حصہ بنایا اور عوام میں اردو کی مقبولیت کے پیش نظر اسے قومی زبان کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی عدالتوں اور دفتروں کی زبان انگریزی ہوگئی اور نچلی سطح پر عدالتی اور انتظامی زبان اردو قرار پائی۔ عدالتوں کی نچلی سطح پر درخواست اردو میں دی جا سکتی تھی۔ زمینوں کے ریکارڈ اردو میں رکھے جانے لگے۔ بہت سی

ریاستوں کی عدالتوں میں گواہی اردو میں دی جانے لگی اور اس کا ریکارڈ بھی اردو میں رکھا جانے لگا۔ ان حالات کے کے پیش نظر دفتروں اور قانون کی کتابوں کے اردو تراجم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں دفتری اور قانونی کتب کے اردو ترجمے بڑے پیمانے پر کیے جانے لگے۔ اس سلسلے میں گلیڈ ون کی لغت، ایچ ایچ ولسن کی گلوسری آف جوڈیشیل اینڈ ریونیو، درگا پرشاد کی گائڈ ٹو لیگل ٹرانسلیشن وغیرہ ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ کتابیں مقامی اردو، فارسی، عربی و دیگر ہندوستانی زبانوں میں موجود انتظامی اصطلاحوں کو سمجھنے کے لیے انگریزی میں لکھی گئیں ہیں۔

اردو میں دفتری اور قانونی ترجمے کی بہت سی کوششیں ہوئیں اور اب اردو میں قانونی اصطلاحات کا وافر ذخیرہ موجود ہے اور یہ اصطلاحیں بڑ حد تک زیر استعمال بھی ہیں۔ اردو میں قانونی اور دفتری ترجمے کے لیے پہلا بڑا اور اہم نام ڈپٹی نذیر احمد کا ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ انکم ٹیکس ایکٹ کا ترجمہ 'قانون انکم ٹیکس' کے نام سے انگریزی سے اردو میں کیا۔ انھوں نے انڈین پینل کوڈ کے اٹھارہویں باب کا ترجمہ 'مجموعۂ قوانین تعزیرات ہند' کے نام سے 1860 میں کیا اور 1861 میں تعزیرات کے ضمیمے کا ترجمہ 'ضابطۂ فوجداری' کے نام سے کیا۔ ان کی وضع کردہ اصطلاحیں آج بھی رائج ہیں۔ انیسویں صدی میں جو ترجمے میں ان میں منشی زوار حسین کی لغت 'فرہنگ فرنگ' مطبوعہ 1887، بہت اہم ہے۔

دفتری اور قانونی اصطلاح کے سلسلے میں اردو میں بہت کام ہوا ہے۔ بڑی تعداد میں ان اصطلاحوں کو یکجا کیا گیا یا جدید اصطلاحات وضع کی گئیں۔ عطش درانی کے مطابق: دفتری و قانونی اصطلاحات کی لغات خاصی بڑی تعداد میں اردو میں شائع ہوئی ہیں اور خاص طور پر قانون کے موضوع پر زیادہ لغتیں تیار ہوئیں۔ قانونی اور دفتری تراجم کے تناظر میں جو لغات تیار کی گئیں ان میں گلیڈن (1797)، روسو (1802)، فیلن (1879) وغیرہ کی مرتبہ لغات اردو اور مقامی زبانوں سے انگریزی میں ہیں جب کہ اردو سے اردو لغتوں میں شمس الدین خاں کی اردو قانونی ڈکشنری، مختصر قانونی لگات، اور لغات قانونی شامل ہیں۔ انگریزی سے اردو لغت نویسی کا پہلا کام ڈاکٹر فیلن نے کیا۔ اس کے بعد موہن بنرجی کا ٹرانسلیٹر زفرینڈ 1905 میں شائع ہوا اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آر ڈی بھاٹیا کا لغت 1904 میں منظر عام پر آیا۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا جس کی وجہ سے اردو میں دفتری اور قانونی تراجم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ 1949 میں 'مجلس دفتری زبان' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کے ذمے یہ کام سونپا گیا کہ وہ دفتری اور قانونی امور سے متعلق اصطلاحوں کے اردو متبادل پر کام کریں۔ اس ادارے سے ایک بہت جامع اور مستند لغت تیار کی جا چکی ہے۔ جسٹس تنزیل الرحمٰن کا قانونی لغت اس سلسلے میں بہت اہم

ہے۔اس کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر اس کی کئی ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔1982 میں مقتدرہ قومی زبان اور جامعہ کراچی کے تعاون سے ایک لغت تیار ہوا۔1985 میں مجیب الرحمٰن مفتی کا مرتبہ لغت دفتری ترغیبات، محاورات اور فقرات کا لغت شائع ہوا۔1998 میں کشاف قانونی اصطلاحات کے نام سے تین جلدوں میں ایک لغت شائع ہوا۔اسے اب تک کا سب سے جامع لغت قرار دیا جاسکتا ہے۔ہندوستان میں ایسے لغات کم لکھے گئے لیکن دفتروں کے حکم ناموں اور عدلیہ کی کارروائیوں کو اردو میں منتقل کرنے کی روایت کافی مستحکم ہے۔اس کے ساتھ ہی پارلیمانی کارروائیوں اور مباحث کو بھی اردو میں منتقل کرنے کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔دستور اور آئینی ترامیم کے تراجم بھی اردو میں ہوتے ہیں۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں دفتری اور قانونی ترجمے کی ایک متمول اور جامع روایت موجود ہے۔

5.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبا:

- طلبہ کو دفتری و قانونی ترجمے کے فن سے واقف ہوئے
- دفتری و قانونی ترجمے کی اہمیت سے روشناس ہوئے
- دفتری و قانونی ترجمے کی تاریخ سے متعارف ہوئے
- دفتری و قانونی ترجمے کے مسائل سے واقف ہوئے
- دفتری و قانونی ترجمے کی ضرورت اور طریقۂ کار سے واقفیت بہم پہنچا
- دفتری و قانونی ترجمہ کرنے کی لیاقت پیدا کرسکے

5.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1- دفتری اور قانونی ترجمہ کسے کہتے ہیں؟؟

2- دفتری ترجمے کے مسائل پر روشنی ڈالیے؟

3- قانونی ترجمے کی اہمیت واضح کیجیے۔

4- اردو میں تیار شدہ دفتری اور قانونی لغات سے اپنی معلومات کا اظہار کیجیے؟

5.8 سوالات کے جواب

1- دفتری اور قانونی ترجمہ سے مراد کسی بھی زبان میں موجود قانونی دستاویزات، وثیقہ جات، عدالتی احکامات، قانونی معاہدے، حلف نامے اور عدالتی کارروائیوں کا ترجمہ ہے۔ اب اس میں مختلف کمپنیوں اور اداروں کی پالیسیوں اور حکم ناموں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ یعنی ہر وہ کاغذ جس کا تعلق ادارے یا تنظیم کے انتظام و انصرام سے ہو اسے قانونی اور دفتری وثیقہ قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی تمام تحریروں کا ترجمہ 'دفتری اور قانونی ترجمہ' کے زمرے میں شامل ہے۔

2- ترجمہ کی تمام اقسام میں دفتری و قانونی تراجم کی قسم سب سے نازک اور مشکل ہے۔ یہ فن دقت طلبی کے ساتھ وسیع مطالعے اور تجربے کا تقاضا کرتا ہے۔ قانون اور دفتر کی زبان کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کا سیاق اور تناظر الگ ہوتا ہے۔ اس پر عمل کرنے والے افراد مختلف لسانی اور تہذیبی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان تمام باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر دفتری اور قانونی دستاویزات کا ترجمہ ممکن نہیں۔ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل زبان اور ترجمے کی زبان سے بخوبی واقف ہو۔ قانونی تراجم کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں لفظ کی بہت اہمیت ہوتی ہے کیونکہ لفظ کی تبدیلی سے قانون کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اس لیے اس سیاق میں یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ قانونی تراجم لفظی ترجمے پر مبنی ہوں تاکہ کسی قسم کا انتشار اور غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔

3- پوری دنیا میں انتظام و انصرام اور نظم و نسق وائم رکھنے کے لیے طرح طرح کے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ یہ قوانین کسی ایک زبان میں وضع کیے جاتے ہیں لیکن ان کا اطلاق ایک بڑی آبادی ہے پوتا ہے جو اس زبان سے کماحقہ واقف نہیں ہوتے۔ ان کی سہولت اور بعض اوقات بیداری کے مدنظر ان قوانین کے تراجم مقامی زبانوں میں کیے جاتے ہیں تاکہ ان اصول وضوابط سے سبھی آگاہ ہوسکیں۔ انسانی زندگی کی ترقی اور معاشرے کی خوش حالی و بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ قانون علم ہر شخص کو ہو۔ ہمارا معاشرہ ابھی خواندگی اور علم کے معاملے میں ایک حد تک ہی ترقی کرسکا ہے۔ وہ بھی دفتری زبان عموماً ایسی ہوتی ہے جسے عوام کی اکثریت سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اسے سادہ اور عام فہم نیز مقامی زبان میں پیش کرنا مترجم کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے دفتری اور قانونی ترجمے کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔

4- دفتری اور قانونی اصطلاح کے سلسلے میں اردو میں بہت کام ہوا ہے۔ بڑی تعداد میں ان اصطلاحوں کو یکجا کیا گیا یا جدید اصطلاحات وضع کی گئیں۔ قانونی اور دفتری تراجم کے تناظر میں جو لغات تیار کی گئیں ان میں گلیڈن (1797)، روسو (1802)، فیلن (1879) وغیرہ کی مرتبہ لغات اردو اور مقامی زبانوں

سے انگریزی میں ہیں جب کہ اردو سے اردو لغتوں میں شمس الدین خاں کی اردو قانونی ڈکشنری، مختصر قانونی لگات، اور لغات قانونی شامل ہیں۔ انگریزی سے اردو لغت نویسی کا پہلا کام ڈاکٹر فیلن نے کیا۔ اس کے بعد موہن بنرجی کا ٹرانسلیٹر زفرینڈ 1905 میں شائع ہوا۔ آر ڈی بھاٹیا کا لغت 1904 میں منظر عام پر آیا۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا جس کی وجہ سے اردو میں دفتری اور قانونی تراجم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ 1949 میں مجلس دفتری زبان کے نام سے ایک ادارقائم کیا گیا جس کے ذمے یہ کام سونپا گیا کہ وہ دفتری اور قانونی امور سے متعلق اصطلاحوں کے اردو متبادل پر کام کریں۔ اس ادارے سے ایک بہت جامع اور مستند لغت تیار کی جا چکی ہے۔ جسٹس تنزیل الرحمٰن کا قانونی لغت اس سلسلے میں بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر اس کی کئی ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 1982 میں مقتدرہ قومی زبان اور جامعہ کراچی کے تعاون سے ایک لغت تیار ہوا۔ 1985 میں مجیب الرحمٰن مفتی کا مرتبہ لغت دفتری ترغیبات، محاورات اور فقرات کا لغت شائع ہوا۔ 1998 میں کشاف قانونی اصطلاحات کے نام سے تین جلدوں میں ایک لغت شائع ہوا۔ اسے اب تک کا سب سے جامع لغت قرار دیا جا سکتا ہے۔

5.9 فرہنگ

لفظ		معنی
وسیع	:	پھیلا ہوا، بڑا
ہمہ گیر	:	ہر چیز یا موضوع کو اپنی گرفت میں رکھنے والا
رموز	:	رمز کی جمع، اشارہ، معمہ، پہیلی
نکات	:	نکتہ کی جمع، باریکی، تہہ کی بات،
ملحوظ خاطر رکھنا	:	دلی خیال رکھنا، دل سے خیال رکھنا، لحاظ رکھنا
موزوں	:	مناسب، حسب حال
متبادل	:	بدل، عوض
ترمیم	:	اصلاح، درستی، تغیّر و تبدّل

5.10 کتب برائے مطالعہ

فن ترجمہ نگاری	:	خلیق انجم
ترجمے کا فن اور روایت	:	قمر رئیس
ترجمے کا فن	:	از مرزا حامد بیگ

اکائی-06۔اردو صحافتی ترجمے کی روایت و اہمیت اور مسائل

ساخت

6.1 اغراض و مقاصد

6.2 تمہید

6.3 صحافت ایک نظر میں

6.4 ترجمے کی اصلیت و ماہیت

6.5 صحافت اور ترجمے کا رشتہ

6.6 خلاصہ

6.7 آپ نے کیا سیکھا؟

6.8 اپنا امتحان خود لیجئے

6.9 فرہنگ

6.10 سوالات کے جوابات

6.11 کتب برائے مطالعہ

6.1۔اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ

1- صحافت کسے کہتے ہیں۔

2- صحافت کا بنیادی مقصد کیا ہے۔

3- ترجمے کی اصلیت و ماہیئت کیا ہے۔

4- صحافت اور ترجمے کا رشتہ کیا ہے۔

5- صحافتی ترجمے اور علمی و ادبی ترجمے میں کیا فرق ہے۔

6.2 ۔ تمہید

ترجمہ بے شک ایک فن ہے مگر اس کے اصول وضوابط باقاعدہ طور پر تیار نہیں کئے گئے۔ باقاعدہ ان معنوں میں کہ جو اصول وضوابط تشکیل دیئے گئے ہیں ان پر تمام دانشور متفق نہیں ہیں۔ اچھے ترجمے کے معیار کے بارے میں ماہرین کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ البتہ کچھ موٹی موٹی باتوں پر کم وبیش اتفاق پایا جاتا ہے۔ اصل متن اور ترجمہ شدہ متن ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں اور کتنے دور اس سے ہی ترجمے کے اچھے ہونے یا

خراب ہونے کا تعین کیا جاتا ہے۔

موضوع کے لحاظ سے بھی ترجمے ترجمے میں فرق ہو جاتا ہے۔مثلاً ادبی متن، علمی متن اور صحافتی متن کے معیار الگ الگ متعین ہوتے ہیں۔

ترجمے میں لسانی مسائل بھی سامنے آتے ہیں۔ وہ زبانیں جو اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں، ان میں ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے۔جیسا کہ فارسی، پنجابی اور ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ کرنا یا اردو سے ان زبانوں میں ترجمہ کرنا۔مگر یورپی زبانوں سے اردو میں یا اردو سے یورپی زبانوں میں ترجمہ کرنا مشکل ہوگا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہمارے یہاں ترجمے کا فن سکھانے کا کوئی باقاعدہ ادارہ موجود نہیں ہے۔ یہاں لوگ اس فن کو اپنی کاوش یا کسی ترجمہ کرنے والے کی ذاتی تربیت سے سیکھتے ہیں۔

ایک عرصے تک تراجم اور مترجمین کو خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا لیکن آج صورت حال بدل گئی ہے۔ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے کیونکہ آج دنیا اگر گلوبل ویلیج بنی ہے تو اس میں ترجمے کا بہت اہم کردار ہے۔ترجمے کے ذریعے انسان انسان کو پہنچانتا ہے۔ایک دوسرے سے تعلق استوار ہوتے ہیں۔آج اگر ہم بقراط، سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے افکار و نظریات سے آشنا ہوئے ہیں تو یہ ترجمے کی ہی مہربانیاں ہیں۔اسی لئے اب اس کی اہمیت و افادیت کو سمجھا جانے لگا ہے۔

6.3۔ صحافت پر ایک نظر

صحافت کو صرف خبروں کی ترسیل سمجھنا درست نہیں ہے گو کہ صحافت کا بنیادی کام خبروں کی ترسیل ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ کسی مسئلے پر رائے عامہ کی تفسیر و تفصیل بھی کرتی ہے۔اس کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے یا اسے متاثر کرنے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ بدلتے ہوئے حالات پر تبصرہ کر کے لوگوں کو آئے دن کی سرگرمیوں سے باخبر بھی رکھتی ہے۔خبروں کی بنیاد پر مستقبل کی پیشن گوئی بھی کرتی ہے۔ یہ سماجی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حالات کی بنا پر جو رائے قائم کرتی ہے وہ سماجی زندگی کی تعمیری کوششوں کو متاثر بھی کرتی ہے۔

صحافت معاشرے کی تربیت بھی کرتی ہے۔انتظام و امن کے قیام میں مدد بھی دیتی ہے۔معاشرے کی مختلف اقدار کے تحفظ میں معاون بھی ہوتی ہے اور عوامی رجحانات کی رونمائی کے ساتھ ساتھ عوام کے حقوق کی حفاظت بھی کرتی ہے۔صحافت کی تعریف میں یہ بات بطور خاص شامل ہے کہ جو کچھ دنیا بھر میں ہو رہا ہے اگر وہ لوگوں کی دلچسپی، جانکاری اور جوش پیدا کرنے کے لائق ہے تو اسے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صحافی کا یہ فرض بھی ہو جاتا ہے کہ کسی حادثے کی اصل وجہ کیا تھی؟ حادثہ کس طرح اور کیوں ہوا؟ مستقبل میں اس کا کیا اثر ہوگا؟ جیسے سوالوں پر بھی قارئین کو جانکاری فراہم کرائے۔

اکثر ادب کوصحافت پر ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ کسی نے اسے عجلت میں لکھا گیا ادب کہا اور کسی نے اس کی اہمیت کو کم آنکا، لیکن ہر چیز کا اپنے اپنے میدان میں ایک مقام ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ تمام صحافتی ادب عجلت میں لکھا ہوا نہیں ہوتا اور اکثر صحافت میں بھی ایسے مقام آتے ہیں جہاں صحافت اور ادب ایک ہوجاتے ہیں۔ پھر اخبارات میں لکھے گئے کالم اور مضامین تو ادبی حیثیت کے ہی حامل ہوتے ہیں۔ رسالوں کا شمار بھی صحافت میں ہوتا ہے اور ان میں شائع ہونے والے مضامین تو زیادہ تر ادبی اور علمی نوعیت کے ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا صحافت اور ادب کے درمیان کوئی سیدھی لکیر نہیں کھینچی جاسکتی۔ صحافت اور ادب کے درمیان اگر کوئی باریک خط تفریق کھینچا جاسکتا ہے تو یہ کہ ادبی تحریروں کے لئے وقت کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ جبکہ صحافتی تحریروں کے لئے وقت کی پابندی رہتی ہے۔ صحافی کسی واقعے یا حادثے کو بیان کرتے ہوئے، معاشرے کی بات کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جبکہ ادبی تحریروں میں ادیب کی ذاتی فکر بنیاد ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ صحافتی تحریروں کی زندگی مختصر ہوتی ہے مگر ادبی تخلیقات ایک عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں اور آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کرسکتی ہیں۔ مگر ادب کے قاری محدود ہوتے ہیں، اس لئے اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے لیکن صحافت کی وسعت اور دائرہ لامحدود ہے۔

صحافت کے بارے میں ابتدا سے ہی مختلف نظریات سامنے آتے رہے ہیں۔ کچھ اسے صرف تجارت یا پیشے کے نقطۂ نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ مگر بہت سے لوگ اسے اعلیٰ اخلاق کا حامل پیشہ مانتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اعلیٰ مقصد کو نصب العین بنا کر صحافت کے میدان میں قدم جمائے رہنا لائق احترام ہے۔ جس کے تحت صارفی سماج کو مستعد اور ہوش مند رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ایسی صحافت کی گواہی کے لئے جنگ آزادی کی گواہی کافی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے اور یہ خیال آج کل کچھ زیادہ ہی حاوی ہوتا جا رہا ہے کہ صحافی کو وہی دینا چاہئے جو اس کے قارئین کی مانگ ہو۔ یہ بات ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوجاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صحافت کا فرض سچائی کو بے نقاب کرنا ہے۔ لوگوں تک وہ سچ پہنچاؤ جس کا جاننا ان کے لئے ضروری ہو۔

حالانکہ سچ بولنا جہاں صحافی کا مذہب ہونا چاہئے وہیں سچ بولنے کی چھوٹ گورنمنٹ کی طرف سے بھی ہونی چاہیے۔ اسی چھوٹ کا نام پریس کی آزادی ہے۔ جو دنیا کے بڑی ملکوں میں کڑی جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ شروع شروع میں ان ملکوں کے حکمرانوں نے پریس پر زبردست پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ انھوں نے صحافت کے ابتدائی دور میں وہ باتیں ہرگز نہیں چھپنے دیں، جس سے ان کے عمل وارادے کی نقاب کشائی ہونے کے امکان ہوئے، شاید وہ بائبل کے اس قول کی سچائی سے واقف تھے:

''سچ تمہیں آزاد اور نڈر بنائے گا۔''

یہ بات بالکل درست ہے کہ جس سماج میں سچ کہنے کا اختیار نہیں ہوگا، اس میں کسی طرح کی آزادی نصیب نہیں ہوسکتی۔ اس بات کو ترقی یافتہ ملکوں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے آئین میں

جو پہلی ترمیم ہوئی وہ پریس کی آزادی کے لئے تھی۔اس اہم ترمیم میں کہا گیا تھا کہ اخباروں کی آزادی پر پابندی لگانے کا اختیار امریکی کانگریس کو نہیں ہوگا۔

حالانکہ اختیارات اور آزادی کے ساتھ فرض اور ذمہ داری ہمیشہ سے منسلک رہی ہے۔اگر کسی کو کوئی اختیار ملتا ہے تو وہ گویا بہت سی ذمہ داریاں بھی قبول کر لیتا ہے جس سے وہ آزادی کا صحیح حامل ہو سکے۔صحافی کی ذمہ داریوں میں پہلی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو، خودکفیل ہو، جو پریس اقتصادی طور پر آزاد نہیں ہوگا وہ اپنے کام کو آزادی سے کیسے انجام دے سکے گا۔پوری آزادی کے ساتھ کوئی اخبار اسی وقت کام کر سکتا ہے کہ جب وہ کسی سیاسی پارٹی یا حکمرانوں سے کسی مجبوری کی وجہ سے منسلک نہ ہو۔

صحافت کے فرائض میں ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ سے واقعات اور حکمرانوں کے اہم فیصلوں کی ٹھیک ٹھیک جاری جلد سے جلد حاصل کرے اور اسے فوراً عوام تک پہنچائے جو اخبارات سرکار اور دوسرے اداروں کی سرگرمیوں سے پردہ نہیں اٹھا سکتے وہ اپنے وجود کو عزت کے ساتھ زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔پریس کا مذہب ہے بولنا۔سیاست داں خاموش رہ سکتا ہے مگر پریس نہیں۔

صحافی کا رول تاریخ نگار کا سا ہے جو سچ کی تلاش میں رہتا ہے اور مستقبل کے لئے سچے واقعات چھوڑ جاتا ہے۔اچھے صحافی ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ اپنا کام غیر جانبداری کے ساتھ سرانجام دیں۔انھیں قطعی زیب نہیں دیتا کہ وہ چیزوں کو حکمرانوں کی خواہش کے مطابق پیش کریں۔

جمہوری نظام کا مقصد ہوتا ہے کہ اس میں اقلیتوں کی بھی سنی جائے اور ان کی بھی جو سرکار میں شامل نہیں ہیں۔صحافت کو ان کی طرف خاص توجہ دینی چاہئے کیونکہ ان کے پاس اقتدار کی طاقت نہیں ہوتی۔صحافی کے کردار کے لئے سب سے بڑا چیلنج ہے اس کا غیر جانبدار رہنا جو اخبار یا اخبار نویس جانبدار ہو جاتا ہے وہ وقت کے ساتھ نہیں چل پاتا اور اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔

آج ہر شعبے میں نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ترقی کی رفتار کافی تیز ہے۔آج کا قاری چاہتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ جانکاری کم سے کم الفاظ میں مل جائے۔کسی معاشرے کے لئے یہ بیحد ضروری بھی ہے کہ اسے تازہ بہ تازہ واقعات کی اطلاع ہر وقت ملتی رہے بصورت دیگر اس کی ترقی رک سکتی ہے۔لہٰذا صحافت کو چاہیے کہ معاشرے کی یہ ضرورت بحسن وخوبی پوری کرے۔

ایسی متنوع صنف کا ترجمہ کرنا آسان بھی نہیں جتنا آزاد ترجمے کے حوالے سمجھا جاتا ہے۔صحافتی متون کے ترجمے کے لئے مترجم کو صحافت کی ان تمام باریکیوں کو سمجھ کر ہی ترجمہ کرنا ہوگا تبھی وہ کامیاب ہوگا۔

6.4۔ ترجمے کی اصلیت وماہیت

ترجمہ انسانی تمدن، مزاج اور تاریخ کی بازیافت اور شناخت کا ایک بھرپور ذریعہ ہے۔انسان جو

جغرافیائی طول وعرض، رنگوں، نسلوں، زبانوں اور سیاسی بندشوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہے، وہ ترجمے کے ذریعے ایک دوسرے سے متعارف ہوتا ہے۔ ایک عرصے تک غیر ملکی دنیا سے ہمارا تعلق اخباری سطح پر رہا ہے۔ یعنی ہم یہ جانتے ہیں کہ فلاں ملک کس جگہ پر واقع ہے، وہاں کس کی حکومت ہے اور کون سی زبان بولی جاتی ہے۔ یہ معلوماتی تعلق افادی تو ضرور ہے لیکن ہمیں وہاں کے جمہور کے مزاج، تمدن اور زندگی کے ذہنی و جذباتی رنگ و آہنگ کی خبر نہیں دیتا۔ اس کی جانکاری کے لئے ترجمہ ہی ایک ذریعہ ہے جو ان چیزوں کی بھی خبر دیتا ہے۔ ترجمہ انسانوں میں اشتراک پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ زبان کی توسیع، تمدن کا تعارف اور تاریخ سے واقفیت کے لئے ایک سے زیادہ زبانوں سے رابطہ پیدا کرنا ہماری ضرورت ہے۔ کیونکہ دوسری سرگرمیوں کی طرح ترجمہ بھی انسان کو انسان کے قریب لاتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو پھیلاتے ہوئے کہتا ہے کہ زبانیں مختلف سہی، ملک دور دور سہی، مگر انسان ایک غیر منقسم صداقت ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے کو سمجھ نہیں سکتا تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترجمے میں زبان کے ثقافتی کردار پر آنچ آتی ہے اور اصلی متن کی خوبصورتی ضائع ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ زبان میں موجود صنائع بدائع، تراکیب، تشبیہ و استعارات کی بات کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ترجمے کا اصل مقصد ایک نامعلوم زبان کے افکار، خیالات اور تجربات کو معلوم زبان میں داخل کر دینا ہے۔ خصوصاً اخباری مترجم کے لئے صنائع بدائع اور فصاحت و بلاغت پر دھیان دینا ضروری نہیں ہے شاید اسی لئے الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے الگ الگ اصول ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ الفاظ کا ترجمہ کرنے میں درج ذیل اصولوں کو سامنے رکھنا چاہئے:

I۔ ترجمے کو صحیح ہونا چاہئے۔

II۔ حتی الامکان عام فہم ہونا چاہئے۔

III۔ سبک اور خوبصورت ہونا چاہئے۔

ترجمے کا صحیح ہونا ضروری ہے کیونکہ جو تصور اصل میں ہے، وہ اگر نقل میں ادا نہیں ہوتا تو ایسا ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ ترجمے کا عام فہم ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ترجمے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ترجمے کا مقصد عوام کو ان تصورات سے روشناس کرانا ہے جو اصل میں موجود ہیں۔ یہ بات صحافتی ترجمے پر زیادہ عائد ہوتی ہے، اگر ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے معنی عام تعلیم یافتہ آدمی نہیں سمجھتا تو وہ ان تصورات کو کیا سمجھے گا۔

ترجمے کے سبک اور خوبصورت ہونے کی شرط جمالیات کے نقطۂ نگاہ سے ہے۔ لیکن اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ بھدا یا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنے سے بیان میں الجھاؤ اور گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور مطالب کے اظہار اور تفہیم دونوں میں دشواری ہوتی ہے۔ لہٰذا ترجمے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

ان تینوں شرطوں پر برابر توجہ دینا مشکل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا ترجمہ سب شرطوں پر پورا اترے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر لفظ کا لفظی ترجمہ کر دیا جائے۔ اصل عبارت میں اکثر ایسے الفاظ ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول رکھتے ہیں اور ایک تلازمۂ خیال رکھتے ہیں۔ اگر آنکھ بند کر کے ان کے مترادفات رکھ دیئے جائیں تو نتیجہ اکثر مضحکہ ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی کے جملے ''آؤٹ اسٹینڈنگ آرٹسٹ'' کا ترجمہ باہر کھڑا ہوا فنکار کر دیا جائے تو کیسا لگے گا۔

اسی طرح انگریزی لفظ ''لیبر'' کا ترجمہ عام حالات میں محنت ومشقت کرنا ٹھیک ہے لیکن اگر اسپتال کے ''لیبر روم'' کو محنت ومشقت کا کمرہ کہہ دیا جائے تو یہ خاصا مضحکہ خیز ہو جائے گا۔

الفاظ کا ترجمہ نسبتاً آسان ہے لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ترجمہ تحت اللفظ ہو۔ اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو۔ اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں۔ جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی اسلوب یا محاورہ تلاش کرنا چاہئے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو۔ یا اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں تا کہ مطلب کسی حد تک صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے۔

ترجمہ کرنے میں اکثر یہ مشکل آ پڑتی ہے کہ بمقابلہ ترقی یافتہ زبانوں کے اردو میں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی سہولت تقریباً نہیں ہے، مثلاً:

The hygienic siting and spacing of new buildings in a crowded area presents a difficult problem.

اس جملے کا ترجمہ کرنے میں دشواری صرف یہ ہے کہ اردو میں Site اور Space کے مترادفات تو موجود ہیں لیکن انھیں آسانی کے ساتھ Siting اور Spacing میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا، مجبوراً نئے الفاظ گڑھنے پڑیں گے۔ اگر زبان کو وسیع بنانا ہے تو نئے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہئے بلکہ ترجمے میں بھی نئے الفاظ وضع کرنا چاہئے۔ پھر بھی عبارت کا ترجمہ کرنے میں ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہئے جن کے مترادفات پہلے سے اردو میں موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کے مترادفات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے خواہ وہ مترادفات نامانوس ہی کیوں نہ ہوں۔ اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہو تو ایسی صورت میں جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہئے۔

اگر صحافی ان اصولوں کو سمجھ کر ترجمہ کرے اور اسے دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو تو اسے اور اس کے ترجمے کی مقبولیت کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

6.5۔ صحافت اور ترجمے کا رشتہ

کہا جاتا ہے کہ صحافتی مواد کا ترجمہ آسان ہوتا ہے لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ جب تک صحافت کی ضرورت اور فن کو اچھی طرح سمجھ کر ترجمہ نہ کیا جائے۔ اسی لئے اس اکائی کے آغاز میں صحافت کے فن پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ دراصل صحافت میں خبر یا اطلاع کا ایسا اظہار اہم ہوتا ہے جو قاری کو دماغ پر زور دیئے بغیر آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

صحافتی ترجمے کے لئے ایک اور اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے یعنی ''کھلا ترجمہ''۔ اور اس قسم کا ترجمہ مفہومی ترجمے کے ذیل میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

''مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہے۔ ایسے ترجمے میں کسی قسم کی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ مترجم کے لئے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طور پر بیان کر دے جس فن کا ترجمہ کرنا مقصود ہو۔ اگر وہ طویل اور پیچیدہ جملوں پر مشتمل ہو تو لازمی نہیں کہ اس کا ترجمہ بھی اسی طرح طویل اور پیچیدہ جملوں میں کیا جائے۔ بہتر ہے کہ اصل مفہوم کو چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں میں ادا کیا جائے۔'' (مرزا حامد بیگ، صحافتی ترجمہ، مشمولہ خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، 1990ء، ص،)

اسی بات کو عبدالمجید سالک اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لئے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ ان کو چاہئے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترتیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں آیا اصل مطلب ادا ہو گیا ہے۔ اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہو گیا ہو تو سبحان اللہ ورنہ ادھر ادھر کمی بیشی کر کے اسے پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ ہم بڑے انگریزی داں اور بڑے اردو خواں ہیں کیونکہ ممکن ہے وقت پر کس لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آجائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔'' (بحوالہ مسکین علی حجازی، فن ادارت، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 1992ء، ص، 296)

ہمارے یہاں ابتدائی اردو ترجموں سے بہت سے لوگ خوش نظر نہیں آتے اور اسے اردو ترجمے کی ابتری اور

زبان کی فصاحت میں خرابی کا ایک سبب مانتے ہیں۔لیکن ایک دوسرے طبقے کا یہ بھی ماننا ہے کہ اردو میں صحافتی ترجمے جیسے بھی ہوتے ہوں ان سے ہماری زبان صاف ہوئی اوراس کے بیانئے نے ترقی کی ،مثال میں ظفرعلی خاں کو جیسے صحافی کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نہ صرف انھوں نے صحافتی ترجمے کے بیانئے کوفروغ دیا بلکہ بیسیوں سیاسی، معاشرتی اورعلمی اصطلاحیں وضع کیں۔جن میں سے کچھ تو بھاری بھرکم ہیں مگر زیادہ تر انتہائی برجستہ اور ہلکی پھلکی ہیں۔اوران کے زورقلم نے ہردوقسم کی وضع کردہ ''اصطلاحاتِ اخباری'' کوعام کردیا۔

یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ صحافتی ترجمے کا انداز مقرر کرنے میں ظفرعلی خاں اورعبدالمجید سالک کا بہت ہاتھ ہے۔ان کی وجہ سے ہمیں واقعیت، نپی تلی بات کرنے کا سلیقہ، رواں دواں تحریر اوراصلیت سے مطابقت پیدا کرنے کا ڈھنگ آیا۔

صحافتی ترجمے میں خوش بیانی کے بجائے ادائے مطلب پر زور دیا جاتا ہے،اس لئے اس کا ادبیت سے قدرے دور ہونا بھی بہت فطری ہے۔صحافتی ترجمے کے زندگی سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے نئے الفاظ اورنئی پیشہ ورانہ اصطلاحات وجود میں آتی ہیں اوراس طرح کبھی کبھی یہ ادب پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ہمارے یہاں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو اصطلاح سازی کی تربیت دیتا ہو۔جبکہ صحافتی ترجمے میں روز بروز کی نئی ایجادات وانکشافات کی وجہ سے ہرروز نئی اصطلاحیں اور نام وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔جبکہ اردو اخبارات میں ترجمے پر مامور عملے کی راہ نمائی کے لئے بھی کوئی نظام یا ادارہ نہیں ہے۔

صحافت میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے دونوں زبانوں پرعبور کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کا علم بھی ضروری ہے تا کہ مروان کو، مرڈان، Mardan اور ہوئی کو، ہوئی Holi نہ لکھا جائے۔اسی طرح مصر انگریزی میں منتقل ہوتا ہے تو Egypt بنتا ہے لیکن جب Egypt سے دوبارہ مصر بنانا ہوتا ہے تو اکثر غلطیاں ہوتی ہیں۔اس سے مفر جب ہی حاصل ہوگا جب تاریخ، جغرافیہ اورمعلومات عامہ کا پورا علم حاصل ہو کچھ یہی صورت علوم وفنون، مشاغل اورکھیلوں کی معروف اصطلاحات سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

6.6۔ خلاصہ

آج دنیا آپ کے ڈرائنگ روم تک سمٹ گئی ہے اورعلم وایجاد پوری انسانیت کی میراث کا درجہ رکھتی ہے۔ ہرملک اور ہرزبان کے جاننے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ عالمی علم، اطلاع اورخبر سے محروم نہ رہیں۔ اس فطری خواہش کی تکمیل کے لئے انھیں ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

عوامی سطح پر اس خواہش کی تکمیل میں اخبارات نے بہت اہم رول ادا کیا۔اردو اخبارات کے مترجم عموماً صحافتی مواد انگریزی زبان کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔لہٰذا انھیں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی

پوری قدرت حاصل ہونی چاہئے۔

مزید یہ کہ اگر کوئی مترجم اخبارات کے لئے ترجمہ کر رہا ہے تو اسے صحافت کے فن سے بھی واقف ہونا چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر وہ خبر کا ترجمہ کر رہا ہے تو اسے جاننا چاہئے کہ خبر کا ''انٹرو'' کیا ہوتا ہے، اسے کس انداز سے لکھا جاتا ہے۔ پھر خبر میں جو سب سے اہم بات ہوتی ہے وہ سب سے پہلے لکھی جاتی ہے پھر اس سے کم اہمیت والی، پھر اس سے کم اہمیت والی اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ خبر لکھنے کے اس طریقے کو ''الٹا اہرام'' کہتے ہیں۔ خبر لکھنے کے کچھ اور طریقے بھی ہیں۔ ان طریقوں کو اختیار کئے بغیر بھی خبر لکھی جاسکتی ہے مگر وہ زیادہ موثر نہیں ہوگی۔

اخبار کے لئے ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اخبار کے قارئین میں پڑھے لکھے اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسے ایسی زبان کا استعمال کرنا چاہئے جسے سبھی لوگ سمجھ لیں۔ اخباری مترجم اگر سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں گے تو یقیناً انھیں سراہا جائے گا اور قارئین کو بھی الجھن نہیں ہوگی۔

اخباری مترجمین کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ صحافتی ترجمے میں لفظ بہ لفظ یا جملہ بہ جملہ ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی اقتباس کو پڑھ کر مجموعی مفہوم کو اپنی زبان میں پیش کر دینا کافی ہوتا ہے۔ اس میں لفظوں کے متبادل تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی اقتباس زیادہ طویل یا پیچیدہ ہے تو اس کے مفہوم کو بھی مترجم اپنی زبان میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں پیش کر سکتا ہے تاکہ اس کی پیچیدگی اور طوالت کم ہو جائے کیونکہ اخبار میں جگہ کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔

ہمیں اخباری ترجمے میں بناؤ سنگھار اور خوش بیانی تلاش کرنے کے بجائے نفس مضمون کی ادائیگی پر توجہ دینی چاہئے، یہی معیاری اخباری ترجمے کا راز ہے۔

6.7۔ آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے ذریعے ہم نے:

1- صحافت کے بنیادی اصولوں کی جانکاری حاصل کی۔

2- ترجمے کی اصلیت و ماہیت کو سمجھا۔

3- صحافت اور ترجمے کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کی۔

4- صحافتی ترجمے کے اہم نکتوں کی جانکاری حاصل کی۔

5- صحافتی ترجمے اور علمی و ادبی ترجمے کے فرق کو سمجھا۔

6.8۔ اپنا امتحان خود لیجئے

1- اگر زبان کو وسیع بنانا ہے تو کیا کرنا چاہئے؟

2- اصل عبارت میں اگر جملہ پیچیدہ اور لمبا ہو تو مترجم کو کیا کرنا چاہئے؟

3- ''کھلا ترجمہ'' کی اصطلاح کس قسم کے ترجمے کے لئے استعمال ہوتی ہے؟

4- اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت کیا ہے؟

5- مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے؟

6.9۔ فرہنگ

الفاظ	معنی
لسانی	زبان سے متعلق
افادیت	فائدہ
ترسیل	بھیجنا، روانہ کرنا
تفسیر	تشریح، تفصیل، وضاحت
نوعیت	خصوصیت
لامحدود	جس کی کوئی حد نہ ہو
منسلک	جڑا ہوا، وابستہ
اقتدار	زور، طاقت، بڑائی
متن	عبارت
بازیافت	پھر سے پانا
شناخت	پہچان
افادی	فائدہ مند
غیر منقسم	جسے بانٹا نہ جا سکے
تفہیم	سمجھ
تلازمہ	مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال، رعایت لفظی
مقدم	ترجیح دینا
وضع کرنا	بنانا
کثیر لسانی	کئی زبانوں والی

6.10۔ سوالات کے جوابات

1- اگر زبان کو وسیع بنانا ہے تو نئے الفاظ گڑھنے چاہئیں۔

2- پیچیدہ اور لمبا جملہ ہونے کی صورت میں جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ترجمہ کرنا چاہئے۔

3- ''کھلا ترجمہ'' کی اصطلاح صحافتی ترجمے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

4- اخباری ترجمے کے لئے سب سے مقدم مصلحت مطلب کا بالکل واضح ہونا اور عبارت کا سلیس ہونا ہے۔

5- مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ڈکشنری ہے۔

6.11۔ کتب برائے مطالعہ

1- اعجاز راہی (مرتب)، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1994ء

2- مرزا حامد بیگ، مغرب کے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1988

3- نثار احمد قریشی، ترجمہ روایت اور فن، اسلام آباد، 1985ء

4- خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، 1990ء

5- قمر رئیس، ترجمے کا فن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1976ء

اکائی 07 اردو میں سائنسی ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت :

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 اردو میں سائنسی ترجمے کی اہمیت

7.4 اردو میں سائنسی ترجمے کی روایت

7.5 اردو میں سائنسی ترجمے کے مسائل

7.6 آپ نے کیا سیکھا

7.7 اپنا امتحان خود لیجیے

7.8 سوالات کے جوابات

7.9 فرہنگ

7.10 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبا:

- سائنسی ترجمے کے فن سے واقف ہوسکیں گے
- سائنسی ترجمے کی اہمیت سے روشناس ہوسکیں گے
- سائنسی ترجمے کی تاریخ سے متعارف ہوسکیں گے
- سائنسی ترجمے کے مسائل سے واقف ہوسکیں گے
- سائنسی ترجمے کی ضرورت اور طریقۂ کار سے واقفیت بہم پہنچا سکیں گے

7.2 تمہید

گزشتہ اسباق میں آپ نے ترجمہ کے فن اوراس کی اہمیت اوراردو میں ترجمے کی روایت سے متعلق تفصیلات کا مطالعہ کیا ہے۔ترجمے کا میدان بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔تحریری ترجمہ نگاری سے پہلے زبانی ترجمانی کا ایک دور گزر چکا ہے اور آج بھی یہ کسی نہ کسی صورت رائج ہے۔تحریری ترجمے کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔اس کی بھی کئی قسمیں ہیں جن میں 'سائنسی اور علمی تراجم' اپنی بعض ترجیحات کے سبب نہایت اہم اور ضروری تصور کیے جاتے ہیں۔آئندہ اوراق میں ہم ترجمہ کی اسی خاص قسم 'سائنسی ترجمے' کے رموز ونکات اوران کی باریکیوں کے ساتھ ساتھ اردو میں اس کے آغاز وارتقا کے بارے میں پڑھیں گے۔

7.3 سائنسی ترجمے کی اہمیت

سائنسی ترجمہ کو علمی ترجمہ کے طور پر بھی متعارف کیا جاتا ہے اور عام طور پر دونوں کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔علمی اور سائنسی ترجمہ سے مراد مختلف علمی،فنی اور تکنیکی علوم پر کتابوں کا ترجمہ ہے جن میں ان علوم کے مباحث اور مسائل ہوتے ہیں۔مثلاً ریاضی،طبیعات،کیمیا،حیاتیات،جغرافیہ،طب،ہندسہ اور ہیئت وغیرہ شامل ہیں۔

ترجمے کے ذریعے علمی وادبی سرمایہ ایک زبان سے دوسری زبان،ایک قوم سے دوسری قوم اور ثقافت سے دوسری ثقافت میں منتقل ہوتا ہے۔انسان کی علمی اور سائنسی تجربات ومشاہدات کے باہمی لین دین سے اس کی ہمہ جہت ترقی کی راہیں آسان ہوتی ہیں۔مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں دنیا لین مختلف زبانوں میں موجود علمی وادبی سرمایوں کو عربی زبان میں منتقل کیا جس کے باعث ان کے یہاں بلند پایہ علما،مفکرین اور سائنسداں پیدا ہوئے۔بعد میں مغربی ممالک بالخصوص یورپ نے عربوں کی علمی وسائنسی ترقی سے استفادہ کیا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ انہی تراجم کی مرہون منت ہے۔

گزشتہ صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی نے جس برق رفتاری سے ترقی اس کی مثال انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔اطلاعات کے نئے نئے ذرائع نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل فون کی ایجاد نے ساری اطلاعات کو انسان کی ہتھیلی میں سمیٹ دینے کا حیرت ناک کارنامہ انجام دیا ہے۔ایسے حالات میں جب کہ ٹکنالوجی اور سائنسی ترقیات سے کسی کو مفر نہیں زبان کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔اطلاع کی زبان عموماً وہی ہوتی ہے جس میں اطلاع پہلے پہل دی جاتی ہے لیکن اسے دور دور تک پہنچانے کا کام مترجمین ادا کرتے ہیں۔سائنسی تراجم پہلے بھی انسانی ترقی کے لیے لازمی تصور کیے جاتے تھے لیکن

اب اسے ناگزیر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے موجودہ دور میں زبان کی ترقی اور زیادہ سے زیادہ زبانوں کی شمولیت کوانٹرنیٹ اور دیگر سائنسی میدان میں ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم اور علم سیکھنے کا اپنا لطف ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے سائنسی تراجم کی اہمیت اور ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس بات پر زور دیا گیا کہ عوام میں سائنسی فکر اور سائنٹفک سوچ کو فروغ دیا جائے۔سائنسی تراجم کے سیاق میں یہ ایک اہم اشارہ تھا کہ عوام کو ان کی زبان میں سائنس اور سائنسی طرز فکر کو پہنچایا جائے۔اس سے ایک طرف عوام کی معلومات میں اضافہ ہوگا دوسری جانب ان کے اندر سائنٹفک سوچ پیدا ہوگی۔اس مقصد کے حصول کے لیے بھی سائنسی تراجم اہم ہو جاتے ہیں۔سائنسی تراجم کے سیاق میں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اگر سائنسی مضامین اور نئی اطلاعات کے تراجم نہیں ہوئے تو نئی ٹکنالوجی سے استفادہ ممکن نہیں اور اس طرح انسانی آبادی کا ایک حصہ ان ترقیات سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جائے گا۔ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی تراجم انسان کی ترقی اور زبان کو متمول بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

7.4 سائنسی ترجمے کی روایت

اردو کا شمار دنیا کی جدید زبانوں میں ہوتا ہے اور یہ اپنی شیرینی اور شعری وادبی سرمایے کے سبب توجہ کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کا لسانی سرمایہ سائنسی مضامین کی ترجمانی کی متحمل نہیں ہے۔اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں سائنسی اصطلاحات پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جیسی توجہ درکار تھی لیکن اس کے باوجود اس سائنسی اور تکنیکی ادب کی مسابقت میں اردو کسی دوسری زبان سے بہت پیچھے نہیں ہے۔

ہندوستان میں ترجمہ نگاری کا آغاز عہد اکبری میں ہو چکا تھا۔ پہلے پہلے دیگر زبانوں کے تراجم فارسی اور عربی میں ہوئے بعد میں اردو میں بھی ترجمہ نگاری شروع ہوئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو میں سائنسی اصطلاحات اور سائنسی ادب کا آغاز سولہویں صدی میں ہو چکا تھا۔حالانکہ اس زمانے کی کوئی ایسی سائنسی تصنیف نہیں ملی جسے اردو ترجمہ کا نام دیا جاسکے۔اٹھارہویں صدی تک اردو میں جو تراجم ہوئے ان میں بیشتر کا تعلق مذہبی، اخلاقی اور علمی وادبی مضامین سے تھا۔انیسویں صدی کو تراجم کا سنہرا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔اس صدی میں مختلف افراد اور اداروں نے مختلف علوم وفنون، ادب وسائنس اور درسی کتب کے ترجمے اردو میں کیے۔

اردو میں سائنس پر مبنی کتب میں قدیم ترین ترجمہ پادری پرکنس کی تالیف 'بحر حکمت' ہے جس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر نے 1798 میں کیا تھا۔اس میں اسٹیم یعنی بھاپ کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس کے اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کپتان ٹامس روبک کی کتاب 'جہاز رانی' 1811 میں شائع ہوئی جس میں جہاز رانی کی

اصطلاحوں کو اردو میں متعارف کرایا گیا اور کچھ ایسے الفاظ کے اردو متبادل پیش کیے گئے جن کا تعلق جنگ اور فوجی کیمپ سے ہے۔

سید محمد میر لکھنوی کا شمار اردو کے اولین مترجموں میں ہوتا ہے۔ انھوں انیسویں صدی کے آغاز میں علم کیمیا سے متعلق ریورنڈ چارلس کی چھ جلدوں پر مشتمل کتاب کا اردو ترجمہ کیا جو 1828 میں منظر عام پر آیا۔ اسی زمانے میں سات جلدوں پر مشتمل ریورنڈ چارلس کی کتاب 'ستہ شمسیہ' کا ترجمہ میر امن، غلام محی الدین متین حیدرآبادی، مسٹر جانس اور موسیو تنڈرس نے مشترکہ طور پر کیا۔ 1834 میں شاہ علی کی ترجمہ کردہ کتاب 'ترجمہ شرح چغمنی' شائع ہوئی جس کا تعلق علم ہیئت اور فلکیات سے ہے۔ 1836 میں رتن لال نے انگریزی کے ایک رسالے علم جغرافیہ کا اردو ترجمہ کیا اور رسالہ علم ہندسہ مرتب کیا۔ مدرسہ انجینئری حیدرآباد کے پرنسپل رائے منولال نے برنارڈ ہنٹر کی انگریزی کتاب 'علم ہندسہ' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ علم ہندسہ بالوتر کے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب تصور کی جاتی ہے۔ طب اور ادویات کے موضوع سے متعلق کئی کتابوں کے اردو ترجمے ہوئے جن میں ڈاکٹر میکلن کے رسالے 'چیچک' کا اردو ترجمہ خصوصی توجہ کا حامل ہے۔ اس میں چیچک کے اثرات، اس کے علاج اور احتیاط وغیرہ کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1848 میں شائع ہوئی۔ 1851 میں مولوی محمد احمد نے چارلس واکر کی ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جس میں ایک دھات سے دوسری دھات پر ملمع کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ سید محمد عبدالرحمٰن نے فارگیوسن کی کتاب 'علم ہیئت' کے ایک حصے کا ترجمہ 'تحفۂ گراں' کے نام سے کیا ہے۔ یہ تراجم انفرادی دلچسپی اور ضرورت کے پیش نظر کیے گئے تھے۔ اسی زمانے میں اردو ترجمہ کے کئی ادارے قائم ہوئے جن میں سائنسی مضامین کے تراجم اور وضع اصطلاح کے کارنامے انجام دیے گئے۔ ذیل میں ان اداروں کا اختصار کے ساتھ تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اردو میں سائنسی تراجم کی کیا روایت رہی ہے۔

شمس الامرا نواب فخر الدین کا دارالترجمہ:

شمس الامرا نواب فخر الدین نے جدید سائنسی علوم میں خصوصی دلچسپی لی اور یورپ کے مختلف ممالک سے مختلف علوم کی کتابیں منگوا کر ان کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دارالترجمہ کے ساتھ ایک سنگی پریس بھی قائم کیا۔ ان کی کوششوں سے تقریباً پچاس کتابوں کے اردو تراجم شائع ہوئے جن میں حساب، جیومٹری، طبیعات، فلکیات، طب یونانی اور میڈیسن وغیرہ پر مشتمل کتابیں شامل ہیں۔ شمس الامرا خاندان کی علمی و سائنسی خدمات کا سلسلہ 1833 سے 1877 تک جاری رہا۔ اس دوران جو کتابیں شائع ہوئیں میں اصول علم حساب، رسالہ علم آب، رسالہ کیمسٹری، خلاصۃ الادویہ، نافع الامراض، رسالہ حیوانات مطلق وغیرہ خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔

شاہان اودھ کے سائنسی تراجم:

شاہان اودھ کی سائنسی اور علمی وادبی سرگرمیوں کا زمانہ 1833 سے 1853 تک ہے۔اس عہد کے نوابوں نے سائنسی علوم کی اردو میں منتقلی اوراشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔انھوں نے مختلف علوم پر مشتمل انگریزی کتب کے اردوترجمے کرائے اورانھیں مطبع سلطانی سے شائع کیا۔اس عہد میں جوترجمے شائع ہوئے ان میں رسالۂ علوم طبعیہ،رسالۂ مقناطیس،رسالہ علم حرارت،رسالۂ علم کیمیا،رسالہ علم الماء،رسالۂ علم الہوا،رسالہ ہیئت،بحرحکمت وغیرہ۔ان میں سے بیشتر تراجم سید کمال الدین حیدر نے کیے ہیں۔

دارالترجمہ عثمانیہ کے سائنسی تراجم:

اردوزبان میں سائنسی تراجم کی داغ بیل شمس الامرا نے ڈالی تھی جس کے تقریبا سوبرس بعد حیدرآباد میں نواب میرعثمان علی خاں کی کوششوں سے دوبارہ شروع ہوئی۔اس مرتبہ یہ کوشش زیادہ منظّم تھی۔دارالترجمہ کا قیام عثمانیہ یونیورسٹی کا ایک عظیم الشان منصوبے کا حصہ تھا۔اس کا مقصداردو میں تعلیم دینااور ہرطرح کے مضامین کواردو میں منتقل کرنا تھا۔درسی کتب کی تیاری اوروضع اصطلاح کے لیے مترجمین اورمصنفین کی تقرری عمل میں آئی۔قاضی محمد حسین کی تقرری ریاضیات کے لیےاور چودھری برکت علی کی تقرری سائنس کے لیے ہوئی۔اس ادارے میں اصطلاح سازی اورمغربی علوم کی اردو میں منتقلی کا غیرمعمولی کارنامہ انجام دیا گیا۔تقریباً تین سو کتابوں کے ترجمے ہوئے جن میں طبیعات،کیمیا،فزیکل کیمیا،آرگینک کیمیا،باٹنی،زولوجی،اناٹومی،امراض نسواں،الجبرا،اسٹرونومی اورجیولوجی جیسے سائنسی علوم پر مشتمل کتابیں شامل ہیں۔

دہلی کالج اورورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی میں سائنسی تراجم:

انیسویں صدی میں جن اداروں نے جدیدعلوم اورسائنس کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں ان میں دہلی کالج اور ورناکلرسوسائٹی اہم ہے۔دہلی کالج کا قیام 1825 میں عمل میں آیا۔اس کالج میں ذریعۂ تعلیم اردوتھا۔ریاضی،سائنس،فلسفہ،تاریخ اوراخلاقیات وغیرہ کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔جدیدعلوم اورسائنسی مضامین کے تراجم کے لیے بوترو نے 1841 میں ایک انجمن قائم کی جسے 1842 میں انجمن دہلی کالج ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا نام دیا گیا۔اس انجمن میں تقریباً 117 کتابیں ترجمے اورتصنیف کے ذریعے تیار ہوئیں۔ اس انجمن کے مترجمین میں ڈاکٹر اسپرنگر،منشی کریم الدین،مولوی ذکاءاللہ،ماسٹر رام چندر کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سوسائٹی کے تحت جوکتابیں شائع ہوئیں ان میں رسالۂ اعمال جراحی،علم مساحت،رسالۂ مقناطیس،حرکیات، علم مناظر،رسالۂ علم برق وغیرہ اہم ہیں۔

سائنٹفک سوسائٹی کے سائنسی تراجم:

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام 1863 میں عمل میں آیا۔اس کے سرپرست ڈیوک آف آرگائل اور سیکریٹری سرسید احمد خاں تھے۔اس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سرسید نے لکھا ہے کہ' ہندوستان میں علم کو پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کر کے چھاپے'۔اس سوسائٹی کے تحت انگریزی کی 37 کتابوں کے ترجمے ہوئے جن میں رسالۂ فلاحت،فن کاشت کاری،رسالۂ علم برقی اور رسالۂ جرثقیل وغیرہ شامل ہیں۔

سائنسی تراجم کے میدان میں جن اداروں نے اپنی خدمات پیش کی ہیں ان میں طامسن انجینیر نگ کالج رڑکی کا نام بھی شامل ہے۔اس کالج میں نصابی کتب کی فراہمی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کی نگرانی میں بہت سی کتب کے ترجمے ہوئے۔ جو کتابیں یہاں اردو میں ترجمہ کی گئیں ان میں استعمال جرثقیل مترجم لالہ منولعل بہاری،قواعد حساب متعلقہ فن انجینیر نگ مترجم لالہ جگ موہن لال،مجموعہ سامان عمارت مترجم لالہ منولال بہاری و منشی روپ چند وغیرہ اہم ہیں۔رڑکی کالج کے علاوہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی گزشتہ کئی برسوں سے سائنسی تراجم کے سلسلے میں اہم کارنامے انجام دے رہی ہیں۔ان کے علاوہ بہت افراد اپنی دلچسپی اور ترجیحات کے سبب بھی سائنسی مضامین کے ترجمے اردو میں کرتے ہیں جنھیں اردو میں شائع ہونے والے رسائل میں قابل لحاظ مقام دیا جاتا ہے۔

اردو میں سائنسی مضامین کے تراجم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں سائنسی مضامین کے ترجمے کی روایت کافی متمول اور ثروت مند رہی ہے۔اگر ترجمے کی معمولی رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے اور سائنس و ٹکنالوجی کے جدید ترین تصورات ک اردو میں منتقل کیا جائے تو اس زبان کے علمی خزانے اور موجودہ سرمایے کو وسیع اور جامع بنایا جاسکتا ہے۔

7.5 سائنسی ترجمے کے مسائل

اردو کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ صرف شعروشاعری اور ادبی تخلیقات کی زبان ہے اور اس میں علم وتحقیق، سائنس اور ٹکنالوجی کے پرمغز موضوعات و مسائل کو بیان کرنے کی قوت اور اہلیت نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت درست معلوم ہونے لگتی ہے جب کوئی سائنسی مضمون سامنے آتا ہے اور وہ ایسی زبان میں ہوتا ہے جسے پڑھ کر مفہوم تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ترسیل کی ناکامی ایسے مضامین کا اہم مسئلہ ہے۔اس کی بڑی وجہ اصطلاح سازی کا فقدان ہے۔اردو میں سائنسی اصطلاح سازی کا کام بہت کمزور رہا ہے۔ایسے لغات اور فرہنگ کی شدید کمی ہے جن میں سائنسی اصطلاحات کے متبادل مندرج ہوں۔

سائنسی تراجم کا ایک بڑا مسئلہ سائنس سے آشنا مترجمین کی نایابی اور کمیابی ہے۔ ایسے افراد مشکل سے ملتے ہیں جنھوں نے سائنس کا مطالعہ کیا ہو اور وہ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں۔ سائنسی ترجمہ لغت اور فرہنگ کی مدد سے ایک حد تک ہی کیا جا سکتا ہے لیکن جب فرہنگ اور لغت ہی موجود نہ ہو تو یہ عمل اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

سائنسی تراجم کا ایک اہم مسئلہ وسائل اور سہولیات کا فقدان بھی ہے۔ سائنسی تراجم کو فروغ دینے کے لیے ایسے افراد اور اداروں کی ضرورت ہے جو ترجمہ نگاروں کی مالی اعانت کر سکے اور ان کی محنت سے تیار کردہ کتابوں کو شائع کرے۔

اگر ان مسائل پر قابو پا لیا جائے تو اردو میں سائنسی تراجم کی راہیں آسان ہو سکتی ہیں اور میں بھی جدید اطلاعات وایجادات کی ترجمانی بہتر طور پر کی جا سکتی ہے۔

7.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے مطالعے سے طلبا:

- سائنسی ترجمے کے فن سے واقف ہوئے
- سائنسی ترجمے کی اہمیت سے روشناس ہوئے
- سائنسی ترجمے کی تاریخ سے متعارف ہوئے
- سائنسی ترجمے کے مسائل سے واقف ہوئے
- سائنسی ترجمے کی ضرورت اور طریقۂ کار سے واقفیت بہم پہنچا سکے

7.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1- سائنسی ترجمہ کسے کہتے ہیں؟؟

2- سائنسی ترجمے کے مسائل پر روشنی ڈالیے؟

3- سائنسی ترجمے کی اہمیت واضح کیجیے۔

4- اردو میں سائنسی ترجمہ اداروں کے نام لکھئے۔

7.8 سوالات کے جواب

1- سائنسی ترجمہ کو علمی ترجمہ کے طور پر بھی متعارف کیا جاتا ہے اور عام طور پر دونوں کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ علمی اور سائنسی ترجمہ سے مراد مختلف علمی، فنی اور تکنیکی علوم پر کتابوں کا ترجمہ ہے جن میں ان علوم کے مباحث اور مسائل ہوتے ہیں۔ مثلاً ریاضی، طبیعات، کیمیا، حیاتیات، جغرافیہ، طب، ہندسہ اور ہیئت وغیرہ شامل ہیں۔

2- اردو کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ صرف شعروشاعری اور ادبی تخلیقات کی زبان ہے اور اس میں علم و تحقیق، سائنس اور ٹکنالوجی کے پر مغز موضوعات و مسائل کو بیان کرنے کی قوت اور اہلیت نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت درست معلوم ہونے لگتی ہے جب کوئی سائنسی مضمون سامنے آتا ہے اور وہ ایسی زبان میں ہوتا ہے جسے پڑھ کر مفہوم تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ترسیل کی ناکامی ایسے مضامین کا اہم مسئلہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ اصطلاح سازی کا فقدان ہے۔ اردو میں سائنسی اصطلاح سازی کا کام بہت کمزور رہا ہے۔ ایسے لغات اور فرہنگ کی شدید کمی ہے جن میں سائنسی اصطلاحات کے متبادل مندرج ہوں۔ سائنسی تراجم کا ایک بڑا مسئلہ سائنس سے آشنا مترجمین کی نایابی اور کمیابی ہے۔ ایسے افراد مشکل سے ملتے ہیں جنھوں نے سائنس کا مطالعہ کیا ہو اور وہ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں۔ سائنسی ترجمہ لغت اور فرہنگ کی مدد سے ایک حد تک ہی کیا جا سکتا ہے لیکن جب فرہنگ اور لغت ہی موجود نہ ہو تو یہ عمل اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سائنسی تراجم کا ایک اہم مسئلہ وسائل اور سہولیات کا فقدان بھی ہے۔ سائنسی تراجم کو فروغ دینے کے لیے ایسے افراد اور اداروں کی ضرورت ہے جو ترجمہ نگاروں کی مالی اعانت کر سکے اور ان کی محنت سے تیار کردہ کتابوں کو شائع کرے۔ اگر ان مسائل پر قابو پالیا جائے تو اردو میں سائنسی تراجم کی راہیں آسان ہو سکتی ہیں اور میں بھی جدید اطلاعات و ایجادات کی ترجمانی بہتر طور پر کی جا سکتی ہے۔

3- گزشتہ صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی نے جس برق رفتاری سے ترقی اس کی مثال انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔ اطلاعات کے نئے نئے ذرائع نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل فون کی ایجاد نے ساری اطلاعات کو انسان کی ہتھیلی میں سمیٹ دینے کا حیرت ناک کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایسے حالات میں جب کہ ٹکنالوجی اور سائنسی ترقیات سے کسی کو مفر نہیں زبان کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اطلاع کی زبان عموماً وہی ہوتی ہے جس میں اطلاع پہلے پہل دی جاتی ہے لیکن اسے دور دور تک پہنچانے کا کام مترجمین ادا کرتے ہیں۔ سائنسی تراجم پہلے بھی انسانی

ترقی کے لیے لازمی تصور کیے جاتے تھے لیکن اب اسے ناگزیر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے موجودہ دور میں زبان کی ترقی اور زیادہ سے زیادہ زبانوں کی شمولیت کو انٹرنیٹ اور دیگر سائنسی میدان میں ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم اور علم سیکھنے کا اپنا لطف ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سائنسی تراجم کی اہمیت اور ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس بات پر زور دیا گیا کہ عوام میں سائنسی فکر اور سائنٹفک سوچ کو فروغ دیا جائے۔ سائنسی تراجم کے سیاق میں یہ ایک اہم اشارہ تھا کہ عوام کو ان کی زبان میں سائنس اور سائنسی طرز فکر کو پہنچایا جائے۔ اس سے ایک طرف عوام کی معلومات میں اضافہ ہوگا دوسری جانب ان کے اندر سائنٹفک سوچ پیدا ہوگی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی سائنسی تراجم اہم ہوجاتے ہیں۔ سائنسی تراجم کے سیاق میں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اگر سائنسی مضامین اور نئی اطلاعات کے تراجم نہیں ہوئے تو نئی ٹکنالوجی سے استفادہ ممکن نہیں اور اس طرح انسانی آبادی کا ایک حصہ ان ترقیات سے استفادہ کرنے سے محروم ہوجائے گا۔ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی تراجم انسان کی ترقی اور زبان کو متمول بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

4- اردو میں جن اداروں نے جدید علوم اور سائنس کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں ان میں دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی کالج، طامسن انجینیر نگ کالج رڑکی، سائنٹفک سوسائٹی کے سائنسی تراجم، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی وغیرہ اہم ادارے ہیں۔

7.9 فرہنگ

لفظ		معنی
متحمل	:	برداشت کرنے والا
مفر	:	بھاگنے کی جگہ، چھٹکارے کی جگہ
ناگزیر	:	ضروری، لازمی
شمولیت	:	شامل کرنا/ ہونا
وضع اصطلاح	:	اصطلاح بنانا، اصطلاح سازی
متمول	:	مالدار، دولت مند

مسابقت	:	مقابلہ
ثروت مند	:	مالدار، دولت مند
اوصاف	:	خوبیاں
مندرج	:	درج کیا ہوا، لکھا ہوا

7.10 کتب برائے مطالعہ

فن ترجمہ نگاری	:	خلیق انجم
ترجمے کا فن اور روایت	:	قمر رئیس
ترجمے کا فن	:	مرزا حامد بیگ

اکائی:8 اردو میں مذہبی ترجمے کی روایت واہمیت

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد
8.2 تمہید
8.3 اردو میں مذہبی ترجمے کی روایت واہمیت
8.3.1 مذہبی ترجمے کی اہمیت
8.3.2 تفسیروں کے اردو تراجم
8.3.3 شاہ ولی اللہ کے تراجم
8.3.4 قرآن پاک کے اردو ترجم
8.3.5 رگ وید کا اردو ترجمہ
8.3.6 رمائن اور مہابھارت کا اردو ترجمہ
8.4 ماحصل
8.5 آپ نے کیا سیکھا؟
8.6 اپنا امتحان خود لیجیے
8.7 فرہنگ
8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبہ وطالبات! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ:

- اردو میں مذہبی تراجم کی تاریخ سے واقف ہوسکیں گے۔
- مذہبی تراجم کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔
- مختلف مذاہب کے متون کے اردو تراجم کا جائزہ لے سکیں گے۔

- شاہ ولی اللہ کے تراجم کی خصوصیات کو سمجھ سکیں گے۔
- قرآن پاک کے اردو تراجم کی اہمیت کو بیان کر سکیں گے۔
- وید، رامائن، اور مہابھارت کے اردو تراجم کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- اردو میں مذہبی تراجم کی عصری اہمیت کو بیان کر سکیں گے۔
- تراجم کے ذریعے بین المذاہب مکالمے کے فروغ کا تجزیہ کر سکیں گے۔

8.2 تمہید

عزیز طلبہ وطالبات! ترجمہ کسی تحریر یا متن کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا ایسا عمل ہے، جو ایک علمی یا ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کے مترادف ہے۔ یوں یہ نہ صرف زبانوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ تہذیبوں اور خیالات کے تبادلے کا پل بھی ثابت ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں موجود بے شمار زبانیں اور بولیاں، اپنی اپنی تہذیبی خصوصیات کے ساتھ، تخلیقی ادب کا خزانہ رکھتی ہیں۔ ان ذخائر سے استفادہ کرنے اور دیگر زبانوں کے فکر و احساس کو اپنی زبان میں سمونے کے لیے ہمیں ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ترجمے کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ عظیم جرمن شاعر گوئٹے نے اسے انسانی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والا عمل قرار دیا۔ چاہے وہ ادب ہو، مذہب، سائنس، یا فلسفہ، ترجمہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔ یہی عمل ہمیں دنیا کو گلوبل ویلج کے طور پر دیکھنے کے قابل بناتا ہے، جہاں مختلف تہذیبوں اور علوم کے درمیان ہم آہنگی اور تبادلہ ممکن ہوتا ہے۔

اس اکائی میں، ہم مذہبی تراجم کی روایت، ان کی اہمیت، اور ان سے وابستہ مسائل پر غور کریں گے۔ یہ تراجم نہ صرف مذہبی علوم کو عام فہم بنانے کا ذریعہ بنے بلکہ تہذیبوں کے مابین افہام و تفہیم کے عمل میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ اس سبق میں ان پہلوؤں کو سمجھنا اور ان پر بحث کرنا ہماری زبان، تہذیب، اور علمی ورثے کو بہتر طور پر جاننے کا موقع فراہم کرے گا۔

8.3 اردو میں مذہبی ترجمے کی روایت واہمیت

8.3.1 مذہبی تراجم کی اہمیت:

عزیز طلبہ وطالبات! آیئے ہم مذہبی تراجم کی اہمیت پر بات کریں، کیونکہ تراجم کی تمام اصناف میں مذہبی تراجم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک سروے کے مطابق دنیا بھر میں ہونے والے تراجم کا نصف سے بھی زیادہ حصہ مذہبی متون کے تراجم پر مشتمل ہے؟ یہ اعداد و شمار ہمیں بتاتے ہیں کہ مذہبی تراجم کا دنیا کی زبانوں اور تہذیبوں پر کتنا گہرا اثر ہے۔

قرآنِ پاک کا ترجمہ سب سے پہلے لاطینی زبان میں ہوا، پھر فرانسیسی اور اس کے بعد انگریزی میں۔ دنیا میں تقریباً 6500 زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں سے 2355 زبانوں میں انجیل کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور مسلمان تجزیہ نگاروں کا دعویٰ ہے کہ قرآنِ مجید کا ترجمہ بھی دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اب ذرا اردو زبان پر نظر ڈالیں۔ اردو، جو چھ سے سات صدی پہلے وجود میں آئی، اس میں ترجمے کی روایت کا آغاز تقریباً دو سو سال بعد ہوا۔ اردو زبان میں پہلا ترجمہ ''تمہیداتِ عین القضاۃ'' کا تھا، جسے شاہ میراں جی خدانما نے 1603ء میں ''تمہیداتِ ہمدانی'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ اس کے بعد مذہبی تراجم میں ایک بڑا کارنامہ قرآنِ مجید کے اردو ترجمے کی صورت میں سامنے آیا۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے فرزند شاہ رفیع الدین صاحب نے 1776ء میں اردو زبان میں قرآنِ پاک کا پہلا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ زیادہ لفظی تھا لیکن اس وقت اردو نثر صاف اور رواں ہو چکی تھی۔ بعد ازاں، ان کے حقیقی بھائی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے 1795ء میں فصیح و بلیغ اور رواں زبان میں دوسرا ترجمہ کیا، جو اتنا معیاری تھا کہ اس سے مترجمین نے تراجم کے اصول وضع کیے۔ پھر وقت آیا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ کا، جنہوں نے مالٹا کی جیل میں ان تراجم کو سامنے رکھتے ہوئے ایک نیا اور عمدہ ترجمہ پیش کیا۔ آج اسلامی کتب خانوں میں صرف اردو زبان میں قرآنِ پاک کے ساٹھ سے زائد تراجم موجود ہیں، اور تفسیروں کی تعداد بھی خاصی زیادہ ہے۔ یہ تمام تراجم نہ صرف اردو زبان کی ترقی کا ذریعہ بنے بلکہ مذہبی علوم کو عام فہم زبان میں منتقل کرنے کے لیے سنگِ میل بھی ثابت ہوئے۔ ان کی اہمیت کو سمجھنا اور ان کا مطالعہ کرنا ہمارے لیے نہایت ضروری ہے۔ کیا اب آپ کو اندازہ ہو رہا ہے کہ مذہبی تراجم کا ادب اور زبانوں کی ترقی میں کتنا اہم کردار ہے؟

8.3.2 تفسیروں کے اردو تراجم

تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ:

عزیز طلبہ و طالبات! ہم بات کریں گے ایک ایسی عظیم شخصیت کی، جنہیں امت مسلمہ میں ''ترجمان القرآن'' کے لقب سے نوازا گیا۔ جی ہاں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، جو نبی اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کا فہمِ قرآن اور آیات کی گہرائی کو سمجھنے کا جو ذوق تھا، وہ نبی کریم ﷺ کی دعا کا نتیجہ تھا۔ ان کے علم و بصیرت کی یہ برکت امت کے لیے آج بھی مشعل راہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایات کو مرتب کرنے کا عظیم کارنامہ علامہ فیروز آبادی رحمہ اللہ نے انجام دیا، جو ایک جلیل القدر مفسر، محدث اور علم لغت کے ماہر تھے۔ علامہ فیروز آبادی نے دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کی، حرمین شریفین، ترکی، قاہرہ اور حتیٰ کہ ہندوستان بھی آئے۔ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایات کو جمع کر کے ایک بے مثال خدمت انجام دی، جو آج بھی دنیا بھر میں مقبول ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب بھی ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا، تو سب سے پہلے قرآن کی آیات سے جواب دیتے۔ اگر قرآن میں وضاحت نہ ملتی، تو حدیث اور سنت سے رہنمائی لیتے۔ اور اگر قولِ رسول میں بھی مسئلہ نہ پایا جاتا، تو خلفائے راشدین کے اقوال کو بنیاد بناتے۔ اور جب ان سب ذرائع میں بھی وضاحت نہ ہوتی، تو اپنی رائے بیان کرتے، اور اس کے دلائل بھی مکمل وضاحت کے ساتھ پیش کرتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی اسی احتیاط اور حکمتِ عملی کو نمایاں کیا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں، جنہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو علم و فضل کا مینار بنا دیا اور ان کی تفسیری خدمات کو امت کے لیے ایک عظیم سرمایہ قرار دیا۔ ان کی بصیرت اور علم کی گہرائی آج بھی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ قرآن کی تفہیم میں کتنی احتیاط، گہرائی اور حکمت درکار ہے۔

عزیز طلبہ و طالبات! ایک اور اہم علمی کاوش کا ذکر ضروری ہے، جو قرآنِ مجید کی تفہیم کے میدان میں بے حد نمایاں ہے۔ یہ ہے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''لباب النقول فی اسباب النزول''، جو شانِ نزول کے موضوع پر ایک مستند اور معتبر تصنیف ہے۔ اس کتاب کو اصولِ حدیث اور اصولِ درایت کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے، جہاں روایات کی سندوں کی چھان بین اور تلخیص کی گئی ہے۔

''لباب النقول'' کے مقدمے میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے شانِ نزول کی اہمیت، روایات میں ترجیح کے اصول، ائمہ کے اقوال، اور اپنی طرزِ تلخیص کو نہایت شاندار انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں روایات کی تحقیق کے ساتھ ساتھ راویوں کے بارے میں بھی وضاحت کی گئی ہے کہ کون سے راوی متعلقہ واقعے کے وقت موجود تھے اور کون سے نہیں۔ یہ تحقیق کتاب کی علمی بنیادوں کو مزید مستحکم کرتی ہے۔ یہ کتاب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایت کے ساتھ شائع ہوئی تھی، اور اسی طرح اردو ترجمہ میں بھی دونوں کو ساتھ رکھا گیا۔ مولانا عابد الرحمٰن صدیقی رحمہ اللہ اور حافظ محمد سعید احمد عاطف نے ''لباب النقول'' کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اردو ترجمہ میں ترتیب کچھ یوں ہے کہ پہلے آیت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر، اور اس کے بعد علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی ''لباب النقول'' کی وضاحت۔ ترجمہ میں ہر جگہ ''شانِ نزول'' کو بطور عنوان درج کیا گیا ہے، جہاں آیت کے متعلق تفصیل دی گئی ہے۔ کتاب کے اختتام پر ہر جگہ یہ وضاحت دی گئی ہے کہ یہ معلومات علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب سے لی گئی ہیں۔ اگرچہ بعض جگہوں پر یہ وضاحتی عبارت طباعت میں رہ گئی، لیکن یہ کمی کتاب کے مجموعی علمی معیار پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

تفسیر ابن عباس کے اردو تراجم:

عزیز طلبہ و طالبات! یہاں ہم قرآنِ مجید کی تفسیر کے میدان میں دو عظیم تراجم کا ذکر کریں گے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر، ''تنویر المقباس''، سے متعلق ہیں۔ یہ تراجم علم و تحقیق کی روشنی میں اردو زبان میں منتقل

کیے گئے، تاکہ ایک وسیع حلقہ ان سے استفادہ کر سکے۔

پہلا ترجمہ پروفیسر حافظ محمد سعید احمد عاطف نے انجام دیا، جن کا تعلق بالاکوٹ سے ہے۔ ان کا یہ ترجمہ 2006ء میں ''اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی'' نے شائع کیا۔ تین جلدوں پر مشتمل اس ترجمے میں کل 1503 صفحات ہیں۔ یہ ترجمہ آزاد طرز پر کیا گیا ہے، جس میں زبان کو سلیس اور روانی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے الفاظ کا مناسب اضافہ کیا گیا۔ آیات کی تفسیر سے پہلے ان کے نمبر درج کیے گئے ہیں، اور ہر آیت کے تحت شانِ نزول کی وضاحت بھی کی گئی ہے، جس کے لیے علامہ سیوطی کی ''لباب النقول'' کو شامل کیا گیا۔ مترجم نے اس کام میں دیوبند سے شائع ہونے والے ترجمے سے بھی استفادہ کیا، جس کا اعتراف انہوں نے اپنی عرضِ مترجم میں کیا ہے۔ اس ترجمے کی ابتدا میں ناشر کی جانب سے ایک مقدمہ ہے، جس میں مترجم اور معاونین کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ مترجم نے اپنی عرض میں قرآن، تفسیر اور شانِ نزول کی اہمیت کو اجاگر کیا اور ''تنویر المقباس'' کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ایک تفصیلی مقالہ شامل ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی زندگی، علمی مقام، طرزِ تفسیر، اور ان کی ذہانت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ سیوطی اور علامہ ابوالطاہر فیروزآبادی رحمہ اللہ کے مختصر حالات بھی اس مقالے میں موجود ہیں۔

دوسرا ترجمہ مولانا عابدالرحمٰن صدیقی رحمہ اللہ نے کیا، جو 1970ء میں کلام کمپنی، کراچی، کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ اس ترجمے میں بھی علامہ سیوطی کی ''لباب النقول فی اسباب النزول'' کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت دیوبند کے ادارہ ''درسِ قرآن'' نے کی۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ اور سہل زبان میں ہے، جس میں مشکل الفاظ سے گریز کیا گیا ہے، اور اردو کے معیاری محاورات کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس ترجمے میں آیات کا ترجمہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ترجمے پر مبنی ہے، جو قاری کے اعتماد کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ دیوبند سے شائع ہونے والے اس ترجمے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ دو جید مفتیان، مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی اور مفتی محمد ظفیر الدین، کی نظر سے گزرا ہوا ہے، جو اس کے علمی معیار کو مزید مستند بناتا ہے۔ ان دونوں تراجم میں شانِ نزول کی وضاحت اور قرآن کے مفہوم کو عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، جو علم کے شائقین کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ یہ دونوں کاوشیں قرآن فہمی کے میدان میں ایک روشن چراغ ہیں۔

ترجمہ تفسیر طبری:

'عزیز طلبہ وطالبات!'' جامع البیان فی تفسیر القرآن''، جو ''تفسیر طبری'' کے نام سے معروف ہے، علمِ تفسیر کی دنیا میں اپنی قدامت اور عظمت کی بنا پر ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کے مصنف امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ ہیں، جن کی ولادت 224 ہجری میں ہوئی اور 310 ہجری میں وفات پائی۔ امام طبری، جو اپنی گہرے علمی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کے لیے مشہور ہیں، طبرستان کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے، اسی نسبت سے ''طبری'' کہلاتے

ہیں۔ ''تفسیر طبری'' اسلامی علوم کے عظیم ذخائر میں سے ایک ہے اور اسے تفسیر کا بنیادی ماخذ مانا جاتا ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کی تفسیر کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے، اور اسے تمام طبقہ فکر کے علما اور مفسرین نے اپنی تصانیف میں بطور حوالہ استعمال کیا ہے۔

اردو زبان کے قارئین کے لیے، جو عربی زبان سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتے، یہ تفسیر طویل عرصے تک نا قابلِ رسائی رہی۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مولانا ظہور الباری اعظمی رحمہ اللہ نے اس عظیم تفسیر کا اردو ترجمہ کیا، جو دیوبند کے معروف ادارے ''بیت الحکمت'' کے ذریعے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ قسط وار شائع ہوا اور اردو خواں طبقے تک پہنچایا گیا۔ یہ ترجمہ اپنی زبان کی سلاست اور شائستگی کے لیے نہایت مقبول ہوا۔ معروف ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ نے اپنے رسالے ''صدق جدید'' میں اس ترجمے کی تعریف کرتے ہوئے اسے اردو قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ قرار دیا۔ اسی طرح مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ماہنامہ ''برہان'' میں اس ترجمے کی علمی اور ادبی خوبیوں کو سراہا۔ مولانا ظہور الباری نے ترجمے میں عوام کی ضروریات کو مدنظر رکھا۔ مشکل نحو و صرف کے مباحث کو شامل کرنے کے بجائے آسان اور عام فہم انداز اختیار کیا، تاکہ قارئین قرآن کریم کی تفسیر کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں۔ ترجمے کے متن میں قرات اور لغت سے متعلق مباحث کو سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ یہ ترجمہ علمِ تفسیر کے میدان میں ایک اہم سنگِ میل ہے، جس نے اردو زبان کے قارئین کے لیے ''تفسیر طبری'' جیسی عظیم کتاب کو قابلِ فہم اور قابلِ دسترس بنایا۔ آپ سب کو ترجمے کی اس خصوصیت کا ادراک کرتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔

8.3.3 شاہ ولی کے تراجم

اٹھارویں صدی کے عظیم مفکر و مجدد شاہ ولی اللہ دہلوی ایک ایسی بلند مرتبت شخصیت ہیں کہ جنھوں نے اپنے دور کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھا اور تمام علوم وفنون میں ایسی تجدید کی جو انسانیت کے مسائل کے حل کے لیے ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے اگرچہ تمام علوم وفنون میں نئے زاویوں سے فہم وشعور پیدا کرنے کے لئے بڑا تجدیدی کردار ادا کیا ہے لیکن خاص طور پر قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے، اس کے فہم وشعور کے بنیادی اصول وضوابط مرتب کرنے اور اصولِ تفسیر مدوّن کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ شاہ صاحب کا سب سے بڑا کام علومِ قرآنیہ کی نئی تہذیب و تدوین اور اس میں مفید اضافہ جات ہیں۔ انھوں نے قرآن فہمی کے حوالے سے جن چند نئے بنیادی علومِ قرآنی کا تعارف کرایا ہے، ان میں (۱) ''علم تاویلِ قصص الانبیاء''، (۲) ''علوم خمسہ قرآنیہ''، (۳) ''ترجمہ قرآن حکیم کا جامع اسلوب''، (۴) ''علومِ خواص القرآن'' اور (۵) ''علم حل حروف مقطعاتِ قرآنیہ'' جیسے پانچ اہم علوم ہیں۔ ان پانچ علوم میں سے ایک اہم علم ''ترجمۂ قرآن حکیم کا جامع اسلوب'' ہے۔ شاہ صاحب نے اس حوالے سے مکمل قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس کا نام انھوں نے ''فتح الرّحمٰن بترجمۃ القُرآن''

رکھا۔اس ترجمے کی اہمیت اور حقیقت شاہ صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''دیگر ترجمہ بزبانِ فارسی بوجہے کہ مشابہ عربی باشد در قدرِ کلام، و در تخصیص و تفہیم و غیرِ آں۔ وآں را در ''فتح الرّحمٰن بترجمۃ القُرآن'' ثبت نمودیم۔ ہر چند در بعض مواضع بسبب خوف عدم فہمِ ناظراں بدونِ تفصیل آں شرط را ترک کردہ باشیم۔''

(قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ایسا ترجمہ کیا ہے جو کہ الفاظ کی مقدار میں اور تخصیص وتعمیم وغیرہ میں عربی زبان کے الفاظ کے عین مطابق ہے۔ اور اس کو ہم نے ''فتح الرّحمٰن بترجمۃ القُرآن'' میں اچھی طرح لکھا ہے۔ اگر چہ بعض مقامات میں قارئین کے نہ سمجھنے کے خوف سے، بلا تفصیل عربی زبان کے الفاظ کے مطابق الفاظ لانے کی شرط کو چھوڑ دیا ہے)

شاہ صاحب کے نظر میں صحیح طریقے پر ترجمہ نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک ایسے زمانے میں، جب کہ دنیا بھر میں علماء اس بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ قرآن حکیم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ شاہ صاحب نے اس پر بڑا زور دیا ہے کہ اگر لوگوں کی عمومی زبان، علوم وفنون کی زبان سے مختلف ہو تو یہ بہت ضروری ہے کہ ایسے علوم کا عام لوگوں کی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ شاہ صاحب کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ لوگوں کے لیے علوم و فنون کا صحیح فہم وشعور اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ انھیں کی زبان میں ان علوم وفنون کا ترجمہ نہ کیا جائے۔

8.3.4 قرآن پاک کے اردو تراجم

1۔ عبداللہ ہوگلی 1869ء بمطابق 1245ھ عبداللہ سید 1869ء بمطابق 1254ھ کا ٹائپ شدہ ترجمہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں موجود ہے یہ ترجمہ آٹھ سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔

2۔ سید علی مجتہد 1836ء بمطابق 1252ھ کا ترجمہ وتفسیر 'توضیح مجید میں تنقیح کلام اللہ الحمید' کے نام سے چار جلدوں میں حیدری پریس بمبئی سے شائع ہوا۔

3۔ کرامت علی جونپوری 1837ء 1253ھ کا یہ ترجمہ 'کوکب دری' کے سرکارعالی، حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔

4۔ مولوی انورعلی لکھنوی 1255ھ بمطابق 1839 میں قرآن کا ترجمہ کیا جو کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔

5۔ شاہ رفیع الدین دہلوی محدث دہلوی 1840ء بمطابق 1256ھ کے اس ترجمے کی اشاعت شاہ عبد القادر کے فوائد 'موضح قرآن' کے ساتھ کلکتہ کے ایک قدیم مطبع بنام اسلامی پریس میں طبع ہوا۔ یہ پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں بالترتیب 1838ء بمطابق 1254ھ اور 1840ء بمطابق 1256ھ میں طبع ہوا۔

6۔ سید صفدر حسین مودودی 1844ء بمطابق 1260ھ کا ترجمہ وتفسیر قرآن مجید مع ختم الصحائف مترجم میاں

محمود الحسن کا لیہ ضلع لائل پور کی ملکیت میں موجود ہے۔

7۔ سکندر علی خاں نواب مالیر کوٹلہ 1852ء بمطابق 1268ھ کا ترجمہ 'تفسیر رحمانی' کے نام سے مجتبائی پریس دہلی سے طبع ہوا۔ آٹھ سو اڑتالیس (848) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے حاشیہ پر شاہ عبدالقادر دہلوی کا موضح قرآن دیا گیا ہے۔ بیت القرآن لاہور میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

8۔ صبغۃ اللہ قاضی محمد بدرالدولہ 1860ء بمطابق 1277ھ نے ترجمہ وتفسیر 'فیض الکریم' لکھنی شروع کی جسے ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مفتی محمد سعید اور مفتی محمود نے مکمل کرنے کی کوشش مگر دونوں اپنی وفات کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے۔ ان کے بعد ان کے پوتے مولانا ناصر الدین نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ گویا ترجمہ وتفسیر فیض الکریم تین پشتوں اور چار علما کی محنت کا نتیجہ ہے۔

9۔ نواب قطب الدین خان بہادر دہلوی 1866ء بمطابق 1283ھ نے جامع التفسیر لکھی۔ سورۃ اعلیٰ سے سورۃ الناس کا ترجمہ ان کے شاگرد مولوی عبدالقادر نے مکمل کیا۔ کانپور کے نظامی پریس میں 1866 میں طبع ہوئی۔

10۔ مولانا یعقوب حسن (1866ء بمطابق 1283ھ) کا 'جمائل شریف مترجمہ اردو' کے نام سے اردو ترجمہ قرآن آگرہ کے مینی پریس شائع ہوا۔ یہ دراصل تفسیر جلالین کا عربی سے اردو ترجمہ ہے۔

11۔ مولوی عبدالغفور خاں (1867ء بمطابق 1284ھ) کا اردو ترجمہ جو تفسیر کے ساتھ بنام 'حدائق البیان فی معارف القرآن' مطبع فاروقی، دہلی سے شائع ہوا۔

12۔ سید ظہیر الدین بگرامی (1873ء بمطابق 1290ھ) کا ترجمہ قرآن مجید برٹش میوزیم لائبریری لندن میں موجود ہے۔ یہ ترجمہ چھ سو چوالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

13۔ رؤف احمد رافت نقشبندی مجددی 1876ء بمطابق 1293ھ کا ترجمہ 1832ء تک 'تفسیر رؤفی' کے ضمن میں ہوتا رہا۔ اس تفسیر کا دوسرا نام 'تفسیر مجددی' بھی ہے۔

14۔ محمد حسین نقوی کا ترجمہ تفسیر (1876ء بمطابق 1293ھ) میں شائع ہوئی۔ یہ ترجمہ اور تفسیر مرتضوی پریس دہلی میں طبع ہوئی۔ اس کا مکمل نام معاملات الاسرار فی مکاشفات الاخبار معروف بتفسیر حضرت شاہی ہے۔

15۔ فخر الدین احمد قادری کا ترجمہ 1879ء بمطابق 1296ھ میں شائع ہوا۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھا۔ 'تفسیر قادری' کے نام سے یہ ترجمہ لکھنؤ میں شائع ہوا۔

16۔ کنھیا لال لکھداری کا ترجمہ 1882ء بمطابق 1299ھ میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ قرآن سے مدد لیتے ہوئے کیا گیا۔ یہ ترجمہ سردار جگجوت سنگھ، نبیرہ راجا رنجیت سنگھ کی فرمائش پر عربی

متن کے بغیر لکھا گیا۔ مترجم کی تصویر جو ہندو تھا کی تصویر پہلے صفحے پر چھپی ہے۔ یہ دھرم بک لدھیانہ سے شائع ہوا۔

17۔ عبدالصمد کا ترجمہ 1885ء بمطابق 1302ھ میں 'جواہر الصمدیہ' کے عنوان سے مطبع فاروقی، دہلی سے شائع ہوا۔ اس کو جملہ سورتوں کے مضامین کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ دو سو پچھتر (275) صفحات پر مشتمل مختصر تفسیر بھی ہے۔

18۔ محمد احتشام الدین مراد آبادی کا ترجمہ 1885ء بمطابق 1303 میں لکھا گیا اور ضخیم تفسیر بھی ہے۔ جو 'تفسیر اکبر اعظم کے نام سے موسوم' ہے۔ ترجمہ سلیس اور پراثر ہے۔

19۔ سید علی لکھنوی کا ترجمہ 1895ء بمطابق 1313ھ کا ہے۔ یہ ترجمہ اور تفسیر بنام 'تنویر البیان' کے نام سے مطبع اعجاز محمدی آگرہ سے شائع ہوا۔

20۔ سید زین العابدین نے قرآن کا ترجمہ 1886ء بمطابق 1304ھ میں کیا۔ یہ کاشف النعم کے نام سے کیا گیا ہے۔ الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کے تحت شائع ہوا۔

21۔ مولوی فخر الدین احمد کی تفسیر 1886ء بمطابق 1304ھ میں آئی۔ مولوی صاحب کی تفسیر 'تفسیر قادری' تفسیر حسینی کا ترجمہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1300ھ بمطابق 1882ء میں لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اور دوسرا ایڈیشن لکھنؤ کے نول کشور پریس میں 1304ھ یعنی 1886ء میں شائع ہوا۔

22۔ سید محمد علی کا ترجمہ مع مبسوط حواشی کے 1886ء بمطابق 1303ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ لکھنؤ کے حاجی محمد قلی خان کانپوری پریس میں طبع ہوا۔ متن کے بغیر پہلا ترجمہ پاک و ہند میں ہوا جو ایک شیعہ عالم نے کیا۔ العابدین کا ترجمہ 1887ء بمطابق 1304ھ میں شائع ہوا۔

23۔ حکیم سید محمد حسن امروھی کی 1887ء بمطابق 1305ھ میں ترجمہ و تفسیر 'غایۃ البرہان' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلا ایڈیشن امردھ کے مراد آباد میں اور دوسرا امرودمی سے ریاضی پریس سے طبع ہوا۔

24۔ سید نور الحق منعم نے 188ء بمطابق 1305ھ میں نواب سید محمد فیض اللہ خان کی فرمائش پر ترجمہ و تفسیر لکھی تھی۔

25۔ ابو محمد ابراہیم بن الحکیم عبدالعلی آروی نے 1889ء بمطابق 1307ھ میں قرآن کا ترجمہ 'تفسیر خلیلی' کیا یہ آرہ کے مطبع خلیلی میں طبع ہوا۔

26۔ سید عمار علی رئیس نے 1890ء بمطابق 1307ھ میں ترجمہ اور تفسیر کیا۔ یہ تفسیر 'عمدۃ البیان' کے نام سے دہلی کے مطبع یوسفی سے شائع ہوا۔ یہ ایک ہزار چھ سو چوہتر 1674 صفحات پر مشتمل ہے۔

27۔ احسان اللہ محمد عباسی گورکھپوری نے 1892ء بمطابق 1310ھ میں ترجمہ لکھا۔ یہ اسعدی پریس گھورکھپور میں شائع ہوا۔ احسان اللہ محمد عباس اردو کے معروف مصنف ہیں۔

28۔ مولوی محمد باقر کا ترجمہ 1893ء بمطابق 1310ھ میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوا۔

29۔ ریونڈ ڈاکٹر امام الدین امرتسری کا ترجمہ 1894ء بمطابق 1312ھ میں الہ آباد کے پریس کرسچن مشن مین چھپا تھا۔ مترجم کے نام اور پریس کے سے اندازہ ہوتا ہے یہ ترجمہ کیسا ہے۔ مسیحیت کی جانب سے ایک پروپیگنڈہ ہے۔

30۔ فیروزالدین ڈسکوی سیالکوٹ کا ترجمہ مع حواشی 1894ء بمطابق 1312ھ میں لکھا گیا۔

31۔ محمد احتشام الدین مرادآبادی کی مترجم تفسیر 1895ء بمطابق 1313ھ میں تفسیر اکبراعظم کے نام سے طبع ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن نو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جونول کشور پریس میں لکھنؤ سے طبع ہوا۔ ترجمہ سلیس اور پراثر ہے۔

32۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کا 1895ء بمطابق 1313ھ میں ترجمہ سات جلدوں میں طبع ہوا۔ حواشی سمیت یہ ترجمہ ثنائی کے نام سے امرتسر کے چشمہ نور پریس سے شائع ہوتا رہا۔

33۔ سید علی لکھنوی کا ترجمہ 1895ء بمطابق 1313ھ میں 'تنویر البیان' کے نام سے مطبع اعجاز محمدی آگرہ سے شائع ہوا۔

34۔ مولوی حمید اللہ میرٹھی نے تفسیر و ترجمہ 1897ء بمطابق 1315ھ میں کیا۔ یہ ترجمہ مطبعہ فاروقی میں طبع ہوا۔ دیباچہ میں تفسیر کا نام 'حدیث التفاسیر' دیا گیا ہے۔

35۔ مولانا عبدالمقتدر بدایونی نے 1897ء بمطابق 1315ھ میں ترجمہ و تفسیر قرآن لکھی۔ یہ چند جدید مضامین کے اضافہ کے ساتھ تفسیر عباسی کا ترجمہ ہے۔ اس میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ اور حاشیہ میں تفسیر حسنی ہے۔ یہ آگرہ کے انوری پریس میں طبع ہوئی۔

36۔ عبدالحکیم خان پٹیالوی (متوفیٰ 1940ء بمطابق 1359ھ) نے تفسیر القرآن بالقرآن مع ترجمہ کیا جو عزیزی پریس، تراوڑی، کرنال سے 1901ء بمطابق 1319ھ شائع ہوا۔ اس طباعت کا ایک نسخہ برٹش لائبریری میں موجود ہے۔

37۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا ترجمہ ہے جو خیر المطابع لکھنؤ سے 1902ء بمطابق 1320ھ میں شائع ہوا۔

38۔ سید امیر علی ملیح آبادی (متوفیٰ 17۔1918ء بمطابق 1332ھ) نے 1902ء بمطابق 1320ھ نے مواہب الرحمٰن مع ترجمہ کے زیر عنوان یہ خدمت انجام دی۔ یہ ترجمہ نولکشو پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ آٹھ ہزار پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے جو تیس جلدوں میں ہے۔

39۔ سید شریف حسین نے 1902ء بمطابق 1320ھ میں 'بنام حیدری' ترجمہ وتفسیر لکھی ہے۔ ترجمہ پر سید محمد ہارون زنگی پوری نے نظر ثانی فرمائی تھی۔ عمی کے امامیہ کتب خانہ سے شائع کیا۔

40۔ سید محمد عمر قادری نے 1902ء بمطابق 1320ھ میں 'کشف القلوب' کے تاریخی نام سے ترجمہ اور تفسیر لکھی جو 'تفسیر قادری' کے نام سے مشہور ہے۔ شمس الاسلام پریس، حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔

41۔ محمد عبدالحمید نے 1903ء بمطابق 1321ھ میں 'تفسیر البیان فی ترجمۃ القرآن' کے نام سے ترجمہ قرآن' کے نام سے ترجمہ قرآن کیا جو دہلی سے شائع ہوا۔

42۔ 1905ء بمطابق 1323ھ میں ہونے والا ترجمہ وتفسیر جلالین از جلال الدین محلی وجلال الدین سیوطی جس کے مترجم محمد ابوزر سنبھلی ہیں اس کو آگرہ میں اعجاز محمدی پریس نے شائع کیا۔

43۔ محمد ابوزر سنبھلی نے 1905ء بمطابق 1332ھ میں تفسیر جلالین کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جو مطبع اعجاز محمدی، آگرہ سے شائع ہوا۔

44۔ مولانا وحید الزماں کا ترجمہ 1905ء بمطابق 1323ھ میں تفسیر وحیدری مع ترجمہ موضحۃ القرآن کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ 1933ء بمطابق 1321ھ میں گیلانی پریس لاہور سے طبع ہوا۔

45۔ مرزا محمد امراؤ حیرت دہلوی کا ترجمہ 1902ء بمطابق 1324ھ کرزن پریس دہلوی سے شائع ہوا، صفحات نوسو بارہ (912) ہیں۔ اس طباعت کا ایک نسخہ بیت القرآن لاہور میں ہے۔

46۔ ڈاکٹر محمد حکیم نے 1902ء بمطابق 1324ھ میں 'حمائل التفسیر' کے نام سے کرنال سے شائع ہوا۔

47۔ ثناء اللہ امرتسری نے 1907ء بمطابق 1325ھ میں تفسیر ثنائی کے نام سے ترجمہ وتفسیر کا کام کیا، جسے مطبع اہل حدیث نے شائع کیا۔ واضح ہو کہ یہ مکمل ترجمہ تھا۔ قبل ازیں مترجم کے جزوی ترجمے اور تفسیر چھپتی رہی ہیں۔

48۔ نجم الدین سیوہاروی (متوفی 1928ء بمطابق 1374ھ) نے ترجمہ کیا جو فیض بخش ایجنسی فیروز پور سے شائع ہوا۔ صفحات چار سو ستاسی (387) ہیں۔

49۔ مولانا نظام الدین حسن نے 1907ء بمطابق 1325ھ میں ترجمہ کیا، جو نولکشو پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔

50۔ مولانا فتح محمد جالندھری نے 1908ء بمطابق 1326ھ میں ترجمہ کیا، جو رفاہ عام پریس لاہور سے شائع ہوا۔

51۔ عبداللہ چکڑالوی کا ترجمہ 1908ء بمطابق 1326ھ میں لاہور کے ہندوستان سٹیم پریس میں طبع ہوا۔

52۔ مولانا محمد احسن تعلقداری نے 1909ء بمطابق 1327ھ کا ترجمہ مع تفسیر ہے، جو احسن التفاسیر کے نام سے چھپا۔ افضل المطابع دہلی سے سات جلدوں میں شائع ہوا۔

53۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے 1910ء بمطابق 1328ھ میں خلیفہ اول کا یہ ترجمہ اخبار 'بدر' میں بالاقساط

چھپتا رہا۔اسے میرٹھ کے ایک احمدی نے خیر خواہ اسلام پریس، آگرہ سے کتابی صورت میں شائع کیا۔

54۔ مولانا حکیم نور الدین کا ترجمہ قرآن کی طباعت 1910ء بمطابق 1328ھ میں آگرہ کے خیرا سلام پریس میں ہوئی۔ یہ مولانا کے درس قرآن سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے۔

55۔ شیخ محمد علی دہلوی نے 1911ء بمطابق 1329ھ میں ترجمہ مع حاشیہ کیا جو مطبع اثنا عشری، دہلی سے شائع ہوا۔

56۔ مولانا احمد رضا خان نے 1911ء بمطابق 1329ھ میں ترجمہ کیا، جو کنز الایمان کے نام سے مطبع نعیمی اہل سنت (مراد آباد) سے شائع ہوا۔

57۔ ابو محمد مصلح حیدر آبادی نے 1911ء بمطابق 1329ھ میں ترجمہ کیا جو 'توضیح البیان' کے نام سے مطبع اہل سنت مراد آباد سے شائع ہوا۔

58۔ مولوی سرور شاہ نے 1912ء بمطابق 1330ھ میں ترجمہ مع تفسیر کیا جو 1906 سے 1912 تک رسالہ تعلیم الاسلام، رسالہ تفسیر القرآن اور ریویو آف ریلیجنز کے ضمیمے میں چھپتا رہا۔ مطبع معلوم نہ ہو سکا۔

59۔ نسیم الدین مراد آبادی 1912ء بمطابق 1330ھ میں ترجمہ قرآن طبع ہوا۔ یہ ترجمہ اہل سنت برق پریس مراد آباد میں شائع ہوا۔ اسے خذا من العرفان کا نام دیا گیا ہے۔

60۔ محمد انشاء اللہ نے 1915ء بمطابق 1333ھ میں ترجمہ میں تفسیر کی جو حمیدیہ اسٹیم پریس، لاہور سے آٹھ جلدوں میں شائع ہوا۔ کل صفحات تین ہزار سات سو چالیس ہیں۔ یہ تفسیر علامہ رشید رضا مصری کی تفسیر المنار کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔ تاہم ترجمہ قرآن، محمد انشاء اللہ کی طرف سے ہے۔ اس طباعت کا ایک نسخہ بیت القرآن لاہور، ایک کتاب خانہ ادارہ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) اور ایک نسخہ برٹش لائبریری میں موجود ہے۔

61۔ خواجہ احمد الدین امرتسری کا ترجمہ 1915ء بمطابق 1334ھ میں تفسیر بیان للناس کے نام سے سات جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کی طباعت امرتسر کے دفتر 'امت مسلمہ' سے ہوئی۔

62۔ امیر سید فتح اللہ شیرازی نے 1917ء بمطابق 1335ھ میں ترجمہ مع تفسیری نوٹس شائع کیے۔ اس طباعت کا ایک نسخہ کتاب خانہ آصفیہ سرکار عالی میں موجود ہے۔

63۔ فخر الدین ملتانی نے 1919ء بمطابق 1337ھ میں ترجمہ کیا، جو اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس کی تیاری میں سید محمد سرور شاہ، حافظ روشن علی اور دیگر احمد علما نے بھی حصہ لیا۔ ضخامت 704 صفحات ہیں۔

64۔ شیخ محمد اشرف نے 1920ء بمطابق 1338ھ میں ترجمہ کیا، جو لاہور سے طبع ہوا۔ کل صفحات سات سو بتیس ہیں۔ اس میں دوسرا اردو ترجمہ مولانا وحید الزمان خاں کی طرف سے ہے۔ اس کے حاشیے پر ابو

القاسم محمد عبدہ الفلاحی کے مفصل تفسیری نوٹس ہیں۔

65۔ مقبول احمد دہلوی نے 1921ء بمطابق 1339ھ میں ترجمہ کیا، جو مقبول پریس دہلوی سے شائع ہوا۔نو سو چھیاسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ ترجمہ نواب حامد علی خان رام پوری کے ایما پر کیا گیا۔

66۔ یعقوب حسن نے 1922ء بمطابق 1340ھ میں ترجمہ کیا جو'کتاب الہدیٰ' کے نام سے شائع ہوا۔اس کا مقدمہ'کشاف الہدیٰ' کے نام سے لکھا گیا۔

67۔ مولانا محمود حسن دیوبندی نے 1923ء بمطابق 1341ھ میں ترجمہ کیا، جو'موضح القرآن' کے نام سے مدینہ پریس، بجنور سے شائع ہوا۔ڈاکٹر صالحہ نے اس کی تاریخ 1965ء بمطابق 1344ھ رقم کی ہے۔

مولانا محمد عبد الباری فرنگی محلی نے 1925ء بمطابق 1343ھ میں ترجمہ کیا جو'الطاف الرحمٰن بتفسیر القرآن' کے نام سے تین جلدوں میں چھپا۔نامی پریس لکھنؤ کی طباعت کا ایک حص

68۔ مولانا اشرف علی تھانوی بنام بیان القرآن، سنہ اشاعت 1925ءمطابق 1343ھ مطبع مجتبائی دہلی

69۔ مولانا محمد عبد الباری فرنگی محلی نے 1925ء بمطابق 1343ھ میں ترجمہ کیا جو'الطاف الرحمٰن بتفسیر القرآن' کے نام سے تین جلدوں میں چھپا۔نامی پریس لکھنؤ کی طباعت کا ایک حصہ بیت القرآن لاہور میں موجود ہے۔

70۔ حافظ نواب علی چاٹگامی (متوفی 1953ء بمطابق 1373ھ) کا اردو ترجمہ کنز الرحمٰن فی اسرار القرآن جو خیر المطابع مغرب سے 1925ء بمطابق 1343ھ میں شائع ہوا۔اس طباعت کا ایک نسخہ بیت القرآن لاہور میں موجود ہے۔

71۔ محمد رمضان اکبرآبادی نے 1926ء بمطابق 1344ھ میں تفسیر ابن عباس کا عربی سے اردو ترجمہ کیا، جو مطبع گلشن ہند، آگرہ سے شائع ہوا۔تین سو ایک صفحات پر مشتمل ہے۔

72۔ یعقوب حسن سیٹھ مدراسی کا ترجمہ 1926ء بمطابق 1345ھ میں کتاب الہدیٰ کے نام سے شائع ہوا۔

73۔ محمد بن ابراہیم جوناگڑھی نے 1928 بمطابق 1346ھ میں تفسیر ابن عباس کا اردو ترجمہ کیا، جو نور محمد پریس دہلی سے شائع ہوا۔

74۔ سید احمد حسن دہلوی (متوفی 1338ھ) نے 1928ء بمطابق 1346ھ میں ترجمہ کیا جو'احسن الفوائد' کے نام سے جید برقی پریس دہلی سے طبع ہوا۔صفحات 828 ہیں۔اس کی تفسیر سات جلدوں پر مشتمل ہے، جس کا نام'احسن التفاسیر' ہے۔

75۔ سید ممتاز علی دیوبندی و نجم الدین سیوہاروی نے 1932ء بمطابق 1351ھ میں مشترکہ ترجمہ کیا، جو دار الاشاعت گیلانی پریس لاہور سے چھ جلدوں میں شائع ہوا۔کل صفحات 1143 ہیں۔سید ممتاز علی یہ

ترجمہ مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بقیہ حصہ نجم الدین سیوہاروی نے پورا کیا۔ اس طباعت کا ایک نسخہ بیت القرآن لاہور میں موجود ہے۔

76۔ سید آقا حسن کی ذیل البیان فی تفسیر القرآن 1933ء بمطابق 1352ھ میں عماد الاسلام پریس میں طبع ہوئی۔

77۔ احمد علی لاہور (متوفیٰ 1962ء بمطابق 1381ھ) نے 1934ء بمطابق 1352ھ میں ترجمہ کیا جو انجمن خدام الدین لاہور نے چھاپا تھا۔ ایک ہزار چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ حاشیے پر تفسیر نوٹس شاہ عبد القادر دہلوی کے ہیں۔ (اس طباعت کا ایک نسخہ سنٹرل لائبریری بہاولپور میں موجود ہے۔)

78۔ عطاء الرحمٰن صدیقی کی تفسیر زبدۃ البیان 1934ء بمطابق 1353ھ میں لاہور کے صدیقی پریس سے طبع ہوئی۔

79۔ حکیم یٰسین شاہ نے 1935ء بمطابق 1354ھ میں ترجمہ کیا، جو دین محمدی پریس لاہور نے شائع کیا۔ پانچ سو چوبیس 524 صفحات ہیں۔

80۔ عبدالدائم جلالی نے 1939ء بمطابق 1358ھ میں ترجمہ قرآن کیا، جو حمیدیہ پریس دہلوی سے شائع ہوا۔ چھ سو اسی صفحات پر مشتمل ہے۔

81۔ مولوی محمد علی کی تفسیر مع ترجمہ بیان القرآن 1940ء بمطابق 1359ھ میں تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ انھوں انگریزی میں بھی ترجمہ قرآن کیا ہوا ہے۔

82۔ مولوی فیروز الدین نے 1943ء بمطابق 1362ھ میں ترجمہ کیا جو فیروز سنز لاہور نے چھاپا ہے۔ صفحات نو سو اٹھانوے 998 ہیں۔

83۔ محمد سلیمان فاروقی نے 1947ء بمطابق 1366ھ میں ترجمہ کیا جو دارالاشاعت الفیض امرتسر سے چھپا ہے۔

84۔ محمد اشرف جیلانی کچھوچھوی (متوفیٰ 1961ء بمطابق 1381ھ) نے 1947ء بمطابق 1366ھ میں ترجمہ قرآن کیا۔ مطبع معلوم نہیں۔

85۔ فیروز الدین روحی اکبر آبادی کی تفسیر القرآن مع ترجمہ 1950ء بمطابق 1370ھ میں کراچی کے سول اینڈ ملٹری پریس میں طبع ہوا۔ یہ تین پارے الگ الگ شائع ہوئے۔

86۔ قاری محمد اسماعیل افضل (87) نے 1952ء بمطابق 1371ھ میں 'چراغ ہدایت' کے عنوان سے شیخ غلام علی اینڈ سنز، علمی پرنٹنگ پریس نے شائع کیا۔ سات سو نوے (790) صفحات ہیں۔ اس ترجمے میں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ سے بہت مدد لی گئی ہے۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ لیاقت میموریل لائبریری کراچی میں موجود ہے۔

87۔ ابوالقاسم محمد عتیق نے 1952ء بمطابق 1371ھ میں 'قرآن عظیم کے نام سے' ترجمہ کیا جو لکھنؤ سے شائع ہوا۔

88۔ محمد بن ابراہیم جوناگڑھی نے 1954ء بمطابق 1373ھ میں تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ پانچ جلدوں میں ہے۔کل صفحات دو ہزارنوسوسنتالیس ہیں۔اس کا ایک نسخہ کراچی یونیورسٹی میں بھی موجود ہے۔

89۔ مرزا احمد علی نے 1955ء بمطابق 75۔1374 میں ترجمہ مع کیا حواشی 'لوامع البیان' کیا جو کتب خانہ حسینیہ سے شائع ہوا۔

90۔ عبدالستار دہلوی نے 1956ء بمطابق 1376ھ میں تفسیر ستاری مع ترجمہ مع احسن التفاسیر، مکتبہ سعود کراچی سے شائع ہوا۔

91۔ مرزا البشیر الدین محمود نے 1957ء بمطابق 1377ھ میں ترجمہ تفسیر صغیر مع مختصر حواشی ادارۃ المصنفین ربوہ سے شائع ہوا۔کل صفحات ایک ہزار چار سو چھیاسٹھ ہیں۔

92۔ غلام وارث کا ترجمہ تبیان القرآن یا روح صدق 1960ء بمطابق 1380ھ میں شائع ہوا۔

93۔ غلام احمد پرویز نے 1961ء بمطابق 1381ھ میں قرآنی مفاہیم پر مشتمل اردو ترجمہ کیا جسے میزان پرنٹنگ پریس لاہور نے چھاپا ہے۔

94۔ مولانا حنیف ندوی نے ترجمہ قرآن الحکیم مع تفسیر 1966ء بمطابق 1386ھ کو طبع کروایا۔اس کو لاہور سے ملک سراج دین پبلیشرز نے شائع کیا۔

95۔ ابو محمد مصلح حیدرآبادی کا ترجمہ 'توضیح القرآن' کے نام سے 1966ء بمطابق 1386ھ میں شائع ہوا۔ اس بمبئ سے علی بھائی شرف علی نے شائع کیا۔

96۔ حافظ محمد داؤد خان بن خورشید احمد خاں نے 1968ء بمطابق 1388ھ میں تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ 'الفضل الکبیر' کے نام سے کیا ہے جو مکتبہ الریحان کراچی سے دس جلدوں میں شائع ہوا۔اس طباعت کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) میں موجود ہے۔

97۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ترجمہ قرآن مجید کیا جو مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوا۔ پندرہ سو اسی (1580) صفحات ہیں۔

98۔ ابوالقاسم عتیق فرنگی محلی نے 1970ء بمطابق 1390ھ میں ترجمہ کیا جو ادارہ بحرالعلوم اشاعت القرآن مطبع جاوید سے شائع ہوا۔اس کے حواشی پر ترجمہ نگار نے مختصر نوٹس بھی دیے ہیں۔اس طباعت کا ایک نسخہ بیت القرآن، لاہور میں موجود ہے۔

99۔ محمد عبدالقدیر صدیقی قادری نے 1971ء بمطابق 1391ھ میں ترجمہ مع تفسیر کی جو مطبع سرکار عالی، حیدرآباد دکن سے چھ جلدوں میں شائع ہوا۔اس طباعت کا ایک نسخہ کراچی یونیورسٹی لائبریری میں بھی موجود ہے۔

100۔ محمد سلیم الدین شمسی نے 1972 بمطابق 1392ھ میں ترجمہ اردو اور گجراتی میں چھپا ہے جو ملت پرنٹنگ پریس نے شائع کیا۔نوسوآٹھ صفحات (908) ہیں۔

101۔ الحاج پیر صلاح الدین نے 1974ء بمطابق 1394ھ میں ترجمہ مع تفسیر کیا ہے جو قرآن پبلی کیشنز اسلام آباد نے چار جلدوں میں شائع کیا۔صفحات دو ہزار نوسو بیالیس (2942) ہیں۔مترجم احمدی ہے۔

102۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے 1979ء بمطابق 1399ھ میں ترجمہ مع تفسیر ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور سے پانچ جلدوں میں شائع ہوا۔اورڈاکٹر صالحہ نے اس کی تاریخ 1964ء بمطابق 1387ھ رقم کی ہے۔

103۔ سید محمد شاہ نے 1983ء بمطابق 1403ھ میں ترجمہ مع تفسیر 'مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن' ہے۔ پیکو آرٹ پریس لاہور سے شائع ہوا۔اس کی نظر ثانی مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا شہاب الدین اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے کی ہے۔

104۔ سید حامد حسن بلگرامی نے 1983ء بمطابق 1403ھ میں ترجمہ مع تفسیر ایچ ایم سعید کمپنی کراچی سے شائع ہوا۔تین جلدوں میں ہے۔ڈاکٹر صالحہ نے اس کی تاریخ 1968ء بمطابق 1388ھ رقم کی ہے۔

8.3.5 رگ وید کا اردو ترجمہ

عزیز طلبہ وطالبات! ''رگ وید'' دنیا کی قدیم ترین مذہبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، جس کا اردو ترجمہ عبدالمعین انصاری نے کیا۔ محققین کے مطابق اس کی تصنیف 1500 قبل مسیح سے 500 قبل مسیح کے درمیان ہوئی، تاہم مختلف آراء بھی پائی جاتی ہیں۔مثلاً رومیلا ٹھاپر اسے 1000 قبل مسیح تک مکمل سمجھتی ہیں، جب کہ کوسامی اسے 5001 قبل مسیح کی تحریر قرار دیتا ہے۔ یہ کتاب اپنے اندر قدیم ہندوستانی آریائی قبائل کی مذہبی اور سماجی زندگی کا عکس پیش کرتی ہے۔اس کی زبان نہایت قدیم ہے اور اس میں شاعری اور منتر کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ یہ آریائی قبائل کی عبادات، جنگی حکمت عملی، اور زرعی طرزِ زندگی کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہے۔

''رگ وید'' کے اشعار ہمیں ان قبائل کے اتحاد، جنگوں، اور طرزِ زندگی کی جھلک دکھاتے ہیں، جیسے دس راجاؤں کی لڑائی، جو بعد میں ''مہابھارت'' کی بنیاد بنی۔ یہ کتاب نہ صرف مذہبی متن ہے بلکہ ادب کا ایک قیمتی ورثہ بھی ہے، جس کا مطالعہ آپ کو ہندوستان کی قدیم تاریخ کے قریب لے جاتا ہے۔

8.3.6 رمائن اور مہابھارت کے اردو تراجم

عزیز طلبہ وطالبات! اردو زبان کی وسعت اور مذہبی رواداری کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں رامائن، مہابھارت، اور گیتا جیسے سناتن دھرم کے اہم صحیفوں کے تراجم نہ صرف کیے گئے، بلکہ ان تراجم میں ہندو اور مسلمان ادیبوں نے یکساں حصہ لیا۔ اردو میں رامائن کے تقریباً 300، مہابھارت کے 52، اور گیتا کے 129 سے زائد تراجم ہوئے ہیں، جن میں شاعری اور نثر دونوں شامل ہیں۔

رامائن کا پہلا اردو ترجمہ منشی نول کشور نے 1860ء میں کیا، لیکن اس سے پہلے فارسی میں عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے حکم پر 1589ء میں رامائن کو نثر میں منتقل کیا تھا۔ مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں فارسی زبان میں تراجم کا رواج تھا، اور یہی روایت اردو میں بھی جاری رہی۔ اردو رامائن کے تراجم کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کرداروں کی نفسیاتی گہرائی کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ اردو کے مشہور ادیبوں اور شعرا نے رام اور دیگر کرداروں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ مثال کے طور پر، مہدی نظمی، طالب الہ آبادی، ساغر نظامی، اور دیگر مسلم شعرا نے رام کی عظمت اور انسانی اقدار کی تعریف کی۔ طالب الہ آبادی نے ہنومان کے لنکا میں آگ لگانے کا منظر اور رامائن کے دیگر مشہور واقعات کو فنی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا۔ مہابھارت، جو دنیا کا عظیم رزمیہ ادب ہے، اردو میں بھی مختلف ادیبوں نے ترجمہ کیا۔ مسلم مترجمین میں خواجہ حسن نظامی، عبدالعزیز خالد، اور قاضی محمد نیر قریشی کے نام نمایاں ہیں۔ یہ تراجم نہ صرف ادبی معیار پر پورے اترتے ہیں بلکہ ان میں ہندوستانی تہذیب اور اخلاقیات کے اعلیٰ اصول بھی موجود ہیں۔ شری مدبھگوت گیتا، جس کے اٹھارہ ابواب میں شری کرشن کی نصائح درج ہیں، بھی اردو میں بارہا ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کے نمایاں مترجمین میں ابوالفیض فیضی، الم مظفرنگری، اور بنت زہرہ رضوی شامل ہیں۔

8.4 ماحصل

عزیز طلبہ و طالبات! ہم نے اس اکائی میں مذہبی تراجم کی اہمیت، تفسیروں کے اردو تراجم، شاہ ولی اللہ کی تراجم، قرآن پاک کے تراجم، رگ وید کے تراجم، مہابھارت اور گیتا کے تراجم پر تفصیل سے گفتگو کی۔ مذہبی تراجم نہ صرف زبانوں کے درمیان علم اور ثقافت کا تبادلہ کرتے ہیں بلکہ مختلف مذاہب کے پیغام کو بھی عوام تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ مذہبی تراجم کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ نہ صرف روحانی تعلیمات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے ہیں، بلکہ وہ ایک زبان کے ثقافتی اور مذہبی پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ خاص طور پر، قرآن پاک کے تراجم نے اردو میں دین اسلام کی تعلیمات کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مختلف مترجمین نے قرآن پاک کے اردو تراجم کیے جنہوں نے اس کی تفہیم کو آسان بنایا اور اسے اردو بولنے والے لوگوں تک پہنچایا۔ شاہ ولی اللہ کی تراجم کی اہمیت بھی اسی لحاظ سے خاص ہے کیونکہ انہوں نے اسلامی فلسفہ اور مذہب کو اردو زبان میں پیش کیا۔ ان کے تراجم نے دینی تعلیمات کو عام کرنے کا کام کیا اور اردو ادب کو ایک نئی جہت دی۔ شاہ ولی اللہ کے تراجم نے نہ صرف اردو زبان کو ایک علمی زبان بنایا بلکہ اس کے ذریعے اسلامی نظریات کی تفہیم میں بھی اضافہ کیا۔

ہم نے رگ وید، مہابھارت اور گیتا کے اردو تراجم پر بھی بات کی۔ ان قدیم ہندو متون کے تراجم نے نہ صرف ہندو

مذہب کی تعلیمات کو اردو زبان میں پیش کیا بلکہ ایک دوسرے مذہب کے فلسفے کو سمجھنے کا موقع بھی دیا۔ان تراجم کا مقصد مختلف مذاہب کے پیغام کو ایک دوسرے تک پہنچانا اور اس سے بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینا تھا۔ان متون کے اردو تراجم نے اردو ادب کو وسعت دی اور مختلف ثقافتوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کیا۔اس اکائی کا ماحصل یہ ہے کہ مذہبی تراجم کی روایت نے اردو ادب اور زبان کو عالمی سطح پر اہمیت دی ہے۔ان تراجم نے نہ صرف مذہبی پیغامات کو عام کیا بلکہ ثقافتی اور فلسفیانہ تبادلے کو بھی فروغ دیا۔یہ تراجم آج بھی اردو ادب کی اہمیت میں اضافہ کررہے ہیں اور مختلف مذہبی تعلیمات کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

8.5 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبہ وطالبات !اس اکائی کے مطالعے سے آپ نے درج ذیل نکات سیکھے ہیں:

- مذہبی تراجم کی اہمیت کو سمجھا۔
- ترجمہ نہ صرف زبانوں کا تبادلہ بلکہ ثقافتوں کا بھی تبادلہ ہے۔
- شاہ ولی اللہ کے تراجم کا اردو ادب پر اثر سیکھا۔
- قرآن پاک اور دیگر مذہبی متون کے تراجم کی اہمیت کو سمجھا۔
- مذہبی تراجم نے بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دیا۔
- اردو زبان میں مذہبی اور فلسفیانہ مواد کی موجودگی کا ادراک کیا۔
- مذہبی تراجم نے اردو کو ایک علمی زبان کے طور پر مستحکم کیا۔
- جدید دور میں مذہبی تراجم کی تکنیکوں کو سمجھا۔
- معلوماتی ٹیکنالوجی کے ذریعے ترجمے کی سہولت میں اضافہ ہوا۔

8.6 آپنا امتحان خود لیجیے

1۔ مذہبی ترجمے کی تعریف کیجیے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

2۔ مذہبی متون کے اردو تراجم میں کن اہم شخصیات نے اپنا کردار ادا کیا ہے؟

3۔ شاہ ولی اللہ کی تراجم کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

4۔ قرآن پاک کے تراجم کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ان کے اثرات اور اہمیت پر گفتگو کیجیے۔

5۔ رگ وید اور مہابھارت کے اردو تراجم کے اثرات اور چیلنجز پر روشنی ڈالیے۔

6۔ گیتا کے اردو تراجم کی خصوصیات اور ان کے روحانی اثرات پر گفتگو کیجیے۔

7۔ مذہبی تراجم میں درپیش مشکلات اور ان سے نمٹنے کے ممکنہ طریقے کیا ہیں؟

8۔ مذہبی تراجم میں ثقافتی فرق کو کیسے مدنظر رکھا جاتا ہے؟

9۔ اردو میں مذہبی ترجمے کے ارتقاء میں کن اداروں کا اہم کردار رہا ہے؟

10۔ مذہبی تراجم کی روایت کو آپ کس طرح اردو ادب کی دیگر ترجمہ کی روایات کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں؟

8.7 فرہنگ

(مشکل الفاظ)		(معنی)
تراجم	:	ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا عمل۔
مفاہمت	:	مختلف نظریات یا خیالات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا۔
مذہبی روایات	:	مذہب کے مطابق چلنے والے مخصوص طریقے یا اقدار۔
تفسیر	:	کسی مذہبی یا ادبی متن کی وضاحت، تفصیل سے تشریح۔
تعبیرات	:	کسی لفظ یا جملے کا معنی اور مفہوم۔
مکتبہ فکر	:	ایک خاص گروہ یا طبقہ جو مخصوص خیالات یا نظریات پر یقین رکھتا ہے۔
فکری روایات	:	مختلف ثقافتوں یا قوموں کے علمی ورثے اور نظریات۔
قواعد زبان	:	زبان کے اصول اور قوانین۔
مدارس	:	تعلیمی ادارے، خاص طور پر دینی مدارس۔
تخریج	:	کسی کتاب یا مواد کا جائزہ لے کر اس کی حقیقت یا اصل کو واضح کرنا۔
قدیم متون	:	قدیم دور کے ادبی یا مذہبی مواد۔
تفسیری ادب	:	ادب کی وہ قسم جو کسی دینی یا فلسفیانہ متن کی وضاحت کرتی ہے۔
فلسفیانہ ترجمہ	:	کسی فلسفیانہ مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل۔
قومی تہذیب	:	ایک قوم یا ملک کی ثقافتی ورثہ اور شناخت۔
ثقافتی ہم آہنگی	:	مختلف ثقافتوں کے درمیان افہام وتفہیم اور تعاون۔
روایتی مواد	:	وہ مواد جو کسی خاص روایات یا ثقافت سے جڑا ہوتا ہے۔
انتقادی تجزیہ	:	کسی مواد کا تنقیدی اور جائزہ لینا۔
مفہومی تغیرات	:	کسی عبارت یا خیال کے مختلف معنوں میں تبدیلی۔
پہچان سازی	:	کسی قوم یا زبان کی شناخت کو واضح کرنا۔
نظریاتی ترقی	:	کسی فکر یا نظریے کا ارتقاء اور اس کی نشو ونما۔

8.8 کتب برائے مطالعہ

1۔	قمر رئیس	:	ترجمہ کا فن اور روایت
2۔	مرزا حامد بیگ	:	ترجمے کا فن
3۔	خلیق انجم (مرتبہ)	:	فن ترجمہ نگاری
4۔	محمد طیب دہلوی	:	انگریزی ترجمہ کا فن

اکائی: 9 ’اصطلاح سازی‘

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد
9.2 تمہید
9.3 ترجمہ میں اصطلاح کی ضرورت
-9.4 وضع اصطلاحات
9.5 محاورہ اور اصطلاح کا فرق
9.6 آپ نے کیا سیکھا؟
9.7 اپنا امتحان خود لیجیے
9.8 سوالات کے جوابات
9.9 اگر آپ چاہیں تو
9.10 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ترجمہ نگاری سے واقف ہو سکیں گے۔
- ترجمہ نگاری کے فن سے واقف ہوں گے۔
- اصطلاح کے مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔
- اصطلاح سازی کے عمل سے بہرہ ور ہوں گے۔
- اصطلاح اور محاورہ کے فرق کو سمجھ سکیں گے۔
- اصطلاح بنانے کا فن سیکھ سکیں گے۔

9.2 تمہید

جب کوئی زبان ترقی یافتہ یا مالدار ہونے لگتی ہے تو اس میں اصطلاح سازی کی ضرورت پیش آنے لگتی ہے۔اور یہ عمل اس وقت زیادہ شدّت کے ساتھ سامنے آتا ہے جب نئی نئی چیزوں کو نئے نئے معانی میں سمجھنے کی

مشکل پیش آتی ہے۔ایک بہت بڑے معاملہ کو یا کسی وسیع تر مفہوم کو چند لفظوں میں ادا کرنا مقصود ہو تو اس پورے واقعہ کا ذکر نہ کر کے چند الفاظ میں کہہ دیا جاتا ہے اور متعلقہ اشخاص اس کے مطلب کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔اس ضمن میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قواعد، ادب، نثر، نظم، مصرع، غزل، تغزل، تصوف، شعریت یہ تمام الفاظ ایک طرح سے ادبی وشعری اصطلاحات ہیں۔گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ کم الفاظ میں زیادہ اور گہرے معنی عطا کرنا ہی اصطلاح سازی کا مقصد ہے۔اسی کو علمی وادبی قواعد میں ایجاز کہتے ہیں۔اصطلاح کا سب سے بڑا مقصد یہی ایجاز واختصار ہے۔کبھی کبھی اصطلاح کلام میں دوہرے معنی پیدا کر کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔یعنی کسی شعر یا کسی کلمہ میں ایسی اصطلاح آجاتی ہے جس سے کئی معانی برآمد ہوتے ہیں۔اور یہ فعل علم بلاغت میں محاسن کلام کے نام سے جانا جاتا ہے۔جیسے غالب کے شعر:

موت کا ایک دن معین ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں دن بمعنی وقت اور رات اصطلاحی اور اصلی دونوں معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔یا جیسے غالب ہی نے روزہ کے متعلق کہا تھا:

''حضور! ایک نہیں رکھا۔''

یہاں بھی لفظِ ایک اصلی اور اصطلاحی دونوں معانی پیدا کر رہا ہے اور اسی میں جملہ کی جان ہے۔

9.3 ترجمہ میں اصطلاح کی ضرورت

دنیا کی ہر زبان میں اصطلاحات کا ذخیرہ موجود ہے لیکن ادبی زبانوں میں اصطلاح سازی ایک ممتاز مگر ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔جو زبان جتنی زیادہ علمی، ادبی اور لسانی اعتبار سے اہم ہوگی اور جس زبان کا دائرہ کار جتنا زیادہ وسیع ہوگا، اس زبان میں اصطلاح سازی کا عمل اتنا ہی زیادہ ہوگا۔دراصل اصطلاح بدلتی ہوی دنیا کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔وہ زبان کے اندر نئے الفاظ لے کر نئے معانی کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔یہ عمل علاقائی زبانوں میں بھی اپنی زیریں سطح پر جاری رہتا ہے۔اپنی اپنی بولیاں بولنے والے اپنی گفتگو میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اشاروں کنایوں میں بڑے واقعاتی اور پوشیدہ معانی کو واضح کرتے ہیں۔مثال کے طور پر عام بول چال میں برات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔یہ لفظ ایک خاص مقصد اور مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔اس لئے اس کو عوام کی سطح پر ایک اصطلاح ہی کہا جائے گا۔اسی طرح کے اور دوسرے الفاظ جو جمیع المعانی ہوں اصطلاح کہلاتے ہیں جیسے بازار، واردات، کتابت، خلافت، وزارت وغیرہ۔سیدھے طور پر یوں کہنا چاہیے کہ کسی بھی زبان کا معیار اس زبان کی اصطلاحات پر مبنی ہے اور کوئی بھی زبان اصطلاحات کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی اور نہ ہی اپنے آپ کو زیادہ اہم اور معنی خیز ثابت کرسکتی ہے۔جس زبان کا اصطلاحی ذخیرہ جتنا زیادہ ہوگا وہ اتنی ہی زیادہ اہم تسلیم کی جائے گی۔

9.4 وضع اصطلاحات

وضع اصطلاحات سے ایک بات تو ضرور سامنے آتی ہے کہ اس سے زبان کا دائرہ وسیع اور وقار بلند ہوتا ہے۔ پھر اصطلاح کو گھڑنے کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں ہے۔

اردو میں اب بھی اصطلاح سازی کی شدید ضرورت ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور نئے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے۔ مثلاً Archytypal کے لئے 'قوسیہ' اور Imagery کے لئے 'پیکر تراشی' مقبول ہو چکے ہیں۔ اگر چہ لغوی اور معنوی اعتبار سے یہ اصطلاحیں پورے مفہوم کو ادا نہیں کر پا رہی ہیں اور مصادر و مشتقات کی رو سے ان میں کسر محسوس ہوتی ہے تاہم ادبی حلقوں میں ان اصطلاحت کو تسلیم کر لیا گیا تو پھر نامکمل اصطلاح کہلانے کا حق باقی نہیں رہتا۔ لیکن پھر بھی 'شورٹ'، 'کیمرہ'، 'سین'، 'کالم' اور 'بلیٹن' کے لئے معقول اردو اصطلاحات کے وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ اصطلاح سازی کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وضع اصطلاحات کے لئے وہ لوگ زیادہ موزوں ہیں جو کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔

9.5 محاورہ اور اصطلاح کا فرق

محاورے بھی ایک طرح کی اصطلاحات ہی ہیں کیوں کہ ان میں بھی اصلی معنی کے علاوہ کوئی اور معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن ان محاوروں اور اصطلاحوں میں بڑا نازک سا فرق ہے۔ ایک یہ کہ محاورے میں عام طور پر مفہوم واضح ہوتا ہے اور ہر شخص محاورہ پڑھتے ہی اس کے مجازی معانی کو سمجھ لیتا ہے۔ لیکن اصطلاحات میں یہ بات نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اصطلاح بیش تر یک حرفی یا زیادہ سے زیادہ دو حرفی یا سہ حرفی ہوتی ہیں جبکہ محاورہ ایک طرح سے نامکمل جملہ ہوتا ہے۔ محاورہ اور اصطلاح کا ایک خاص فرق یہ ہے کہ اصطلاح غیر معروف اور ادق الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے اور محاورہ آسان اور عام فہم۔ پھر محاورہ کی خاص پہچان مصدر یا فعل کا حامل ہونا ہے کہ اس کے آخر میں تا۔ تی۔ تے۔ یا نا۔ نی۔ نے ضرور شامل ہوتا ہے جیسے آنکھ دکھانا لیکن اصطلاح میں علامت افعال نہیں ہوتی۔ اگر اسی انسانی عضو سے متعلق 'چشمہ' کہا جائے تو یہ ایک اصطلاح ہوگی جو کئی مجازی معانی کو محیط ہے۔

9.6 آپ نے کیا سیکھا؟

الفاظ کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو اس کے اصلی معنی ہوتے ہیں اور معنی اس کے مصدر و مشتق کے اعتبار سے لئے جاتے ہیں۔ مثلاً لفظِ لغت ہی کو لیجیے۔ 'لغت' کے لفظی معنی 'زبان' کے ہیں گویا جو بھی زبان بولی جاتی ہے وہ 'لغت' ہے۔ لیکن الفاظ کے کچھ دوسرے ایسے معنی بھی ہوتے ہیں جو اس لفظ کے اصلی معنی کے علاوہ ٹھہرا لئے جاتے ہیں۔ ایسے معنی کو اصطلاحی معنی کہتے ہیں اور اس پر خاص و عام، جمیع اقوام متفق ہوتی ہیں۔ سبھی لوگ اس لفظ کے نئے اخذ کردہ معنی پر اتفاق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسی لفظِ لغت ہی کو لیجیے۔ اصطلاحی طور پر 'لغت' اس کتاب

کو کہنے لگے ہیں جس میں تمام الفاظ کے مصادر و معانی لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ معنی مشہور بھی نہیں ہوتے، ایسے معنی کو اس لفظ کے لغوی معنی کہتے ہیں۔ اس طرح اصطلاح سازی وہ عمل ہے جس میں الفاظ کے اصل معنی کو ترک کر کے دوسرے معنی مراد لئے جاتے ہیں اور اس پر تمام لوگ متفق ہوتے ہیں۔ یہ نئے مفاہیم کے الفاظ کبھی تو کثرت استعمال سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے شراب کے لئے 'دارو' پھولوں کی کیاری کے لئے 'تختۂ گلاب' Globalization کے لئے 'عالمگیریت' اور Movie کے لئے 'فلم' چل نکلے ہیں، اگر چہ اس کے لئے تماشہ اور کھیل بھی قصبات و قریات میں بولے جاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ نہایت غور و خوض کے بعد اختراع کیے جاتے ہیں اور پھر ان کو عام لوگوں میں رواج بھی دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کل عام اور نئی اصطلاح Mass Media ہے۔ اس اصطلاح کے لئے بہت سے لوگوں نے ایک عربی قاعدے کے مطابق جوں کے توں الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی اصطلاح کو اردو رسم الخط 'ماس میڈیا' لکھنا پسند کیا ہے یہ قرینہ بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح کہ انگریزی کے کچھ دوسرے الفاظ اور اصطلاحیں اخذ کی گئیں مثلاً 'ناول' اور 'اسکرپٹ' وغیرہ۔ لیکن یہ امر کسی زبان کے لئے کچھ زیادہ عزّت افزائی کا باعث نہیں کیوں کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ زبان الفاظ کے معاملہ میں غریب اور کوتاہ ہے۔ اس زبان کے پاس ذخیرۂ الفاظ کی کمی ہے۔ اگر چہ اخذ و استفادہ کی نگاہ سے اس عمل کو قابل تعریف تصور کیا جاتا ہے کہ یہ زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی طاقت رکھتی ہے مگر اس سے زیادہ مستحسن قدم وہ تھا جس کو مولانا آزاد وغیرہ نے طرح دی تھی یعنی عربی قاعدے کے مطابق اس کے تلفظ میں ذرا سی تبدیلی کر دی تھی جیسے Ego کے لئے 'ایغو' کی اصطلاح گھڑ لی تھی۔ موزّد کرنے کے اس عمل میں اصطلاح کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لینے کا جذبہ بھی شامل تھا۔ Poetics کے لئے 'بوطیقا' کی اصطلاح بھی اسی قبیل کی اصطلاحوں میں سے ہے۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں کسی اصطلاح کے لئے نئے بامعنی الفاظ تراش کر ایک نئی اصطلاح پیدا کی جاتی ہے یا پہلے سے موجود الفاظ کی ترکیب سے وہ نیا مفہوم مراد لے لیا جاتا ہے جیسے Mass Media ہی کے لئے 'ذرائع ابلاغ'، 'ذرائع ترسیل و ابلاغ'۔ یہ صرف 'ترسیل' کی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ لیکن جب تک اصطلاح پوری سوسائٹی میں مقبول نہ ہو جائے اس وقت تک اس کو اصطلاح نہیں مانا جاتا۔ اس لئے یہ عمل ہنوز جاری ہے اور اب Mass Media کے لئے ایک نئی اصطلاح 'ابلاغیات' بھی استعمال ہونے لگی ہے جو پہلے سے زیادہ معقول نظر آتی ہے۔ دراصل اصطلاح اپنے مفہوم میں نہایت جامع اور مکمل ہوتی ہے۔ لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تک جامع اور مکمل اصطلاح کو تمام اہلِ نظر تسلیم نہ کر لیں، اس وقت تک وہ اصطلاح کامیاب نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر مہدی افادی نے جو اصطلاحات وضع کی تھیں، وہ اپنے آپ میں نہایت جامع اور مکمل تھیں۔ لیکن مقبول خاص و عام نہ ہونے کی بنا پر محض کتابوں میں بند ہو کر رہ گئیں اور رواج نہیں پا سکیں۔ انھوں نے High Court

کے لئے 'عدالت عالیہ' اور Supreme Court کے لئے 'عدالت فوقیہ' کی اصطلاحات ساخت کی تھیں جن کو آج استعمال نہیں کیا جاتا۔

9.7 اپنا امتحان خود لیجئے

١۔ اصطلاح کسے کہتے ہیں، اس کا کیا مقصد ہے بیان کیجئے۔

٢۔ اصطلاحات کے کیا فائدے ہیں تفصیل سے لکھئے۔

٣۔ اردو زبان میں اصطلاح سازی کے عمل پر روشنی ڈالئے۔

٤۔ اصطلاح کی اہمیت اور ضرورت واضح کیجئے۔

٥۔ اصطلاحیں عموماً کتنی طرح کی ہوتی ہیں بتائیے۔

٦۔ اصطلاح کو وضع کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

٧۔ اصطلاح کو مکمل اصطلاح کب کہا جائے گا۔

٨۔ کیا اردو میں اب بھی اصطلاح سازی کا عمل جاری ہے۔

٩۔ دوسری زبانوں سے اصطلاحات کب لینی چاہئیں اور کیوں۔

١٠۔ کیا کوئی اصطلاح کسی دوسری اصطلاح کی جگہ رائج ہوسکتی ہے مثالوں سے واضح کیجئے۔

9.8 سوالات کے جوابات

اصطلاح سازی پھلتی پھولتی زبان کی پہچان ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب الفاظ کا ذخیرہ کوتاہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس طرح زبان کی لغات میں معتد بہ اضافہ ہوتا ہے۔ اصطلاح ہمیشہ جمیع المعانی ہوتی ہے۔ اس میں کسی بڑے واقعہ کا مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے یعنی اصطلاح کا مقصد کم سے کم الفاظ میں زیادہ مفصل معانی پیش کرنا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ ایجاز واختصار ہے۔ یہ زبان کا حسن اور زیور بھی ہے، اس سے بلاغت کی شان بھی پیدا ہوتی ہے۔ اصطلاح ہمیشہ لغوی معنی کے علاوہ کسی دوسرے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ اصطلاح اس وقت تک اصطلاح کہلانے کی مستحق نہیں جب تک وہ تمام حلقوں میں رواج نہ پا جائے۔ آج کے زمانے میں متعدد نئے الفاظ بالخصوص انگریزی ادب کے اثر سے داخل ہو رہے ہیں۔ جس زبان میں اپنی ذاتی اور اپنے مزاج کی اصطلاحیں تراشنے اور وضع کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ بہت وافر ذخیرۂ الفاظ رکھنے والی زبان کہلاتی ہے۔ اردو زبان کا مزاج عربی اور فارسی سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کی مدد سے نئی اصطلاحیں بنائی جا سکتی ہیں جیسے ایم اے اور ایم فل کے لئے لیسانس اور فوق لیسانس وغیرہ۔ لیکن بہت سی اصطلاحوں کو معرّب ومفرّس ومورّد کر کے بھی اردو میں داخل کیا جا سکتا ہے جیسے ڈاکٹریٹ کے لئے 'دکتورہ' اور ڈاکٹر کے لئے 'دکتور' استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اصطلاح پذیری کی سب سے ناقص شکل وہ ہے جس میں اصطلاح جوں کی توں قبول کر لی جاتی ہے جیسے

ناول، ڈرامہ، رپورٹ اور بٹن وغیرہ لیکن یہ بھی زبان کی زندگی کی علامتیں ہیں۔ جو زبانیں دوسرے زبانوں کے الفاظ کے لئے دروازہ کھلا رکھتی ہیں وہ زندہ زبانیں مانی جاتی ہیں۔

9.9 اگر آپ چاہیں تو

۱۔ وضع اصطلاحات کی کیا کیا شرائط ہیں لکھئے۔

۲۔ اصطلاح سازی کے بارے میں ایک مفصل نوٹ لکھئے۔

۳۔ اصطلاح کے فوائد اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالئے۔

۴۔ اصطلاح سازی سے پ کیا سمجھتے ہیں تفصیل سے لکھئے۔

۵۔ مکمل اور کامیاب اصطلاح کسے کہتے ہیں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔

9.10 کتب برائے مطالعہ

۱۔ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ: قمر رئیس، ڈاکٹر تو قیر احمد خاں سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اکائی 10: اردو ترجمہ کے ممتاز ادارے (ابتدا تا حال)

ساخت

10.1 اغراض و مقاصد

10.2 تمہید

10.3 اردو ترجمہ کے ممتاز ادارے (ابتدا تا حال)

10.3.1 اردو ترجمہ کے ابتدائی نقوش

10.3.2 فورٹ ولیم کالج

10.3.3 ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

10.3.4 سائنٹفک سوسائٹی

10.3.5 دارالترجمہ عثمانیہ

10.3.6 دارالترجمہ شمس الامرا (حیدرآباد)

10.3.7 نوابین اودھ کے زیر اہتمام علمی و فنی تراجم

10.3.8 مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دارالترجمہ (جموں و کشمیر)

10.3.9 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

10.3.10 ترجمہ نگاری میں دارالمصنفین کی خدمات

10.4 ماحصل

10.5 آپ نے کیا سیکھا؟

10.6 اپنا امتحان خود لیجیے

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبہ و طالبات! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ:

- اردو ترجمہ کے ابتدائی اداروں اوران کے تاریخی پس منظر سے واقف ہوسکیں گے۔
- اردو ترجمہ کے ممتاز اداروں کی اہمیت اور خدمات کو سمجھ سکیں گے۔
- اردو ترجمہ کے اداروں کی ترقیاتی سمتوں اور چیلنجز کو سمجھ سکیں گے۔
- اردو ترجمہ کے اداروں کی عالمی سطح پر اہمیت پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- اردو ترجمہ کے اداروں کی فعالیت اور اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- اردو میں ترجمے کے اداروں کی تخلیقی اور تحقیقی کوششوں کی اہمیت کو بیان کر سکیں گے۔

10.2 تمہید

عزیز طلبہ و طالبات! اردو ترجمہ کی تاریخ میں مختلف اداروں اور تنظیموں کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔ یہ ادارے نہ صرف اردو زبان کو دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب اور علوم سے روشناس کرانے کا ذریعہ بنے، بلکہ انھوں نے اردو میں ترجمہ نگاری کے معیارات اور اصولوں کی تشکیل بھی کی۔ اردو ترجمے کے اداروں کی ابتدا قدیم دور سے ہوتی ہے، جب مختلف تہذیبوں کے درمیان ترجمہ کاری کا عمل شروع ہوا۔ یہ ادارے ابتدا میں بیشتر مذہبی اور فلسفیانہ متون کے تراجم میں ملوث تھے، جبکہ جدید دور میں ان اداروں نے مغربی ادب، سائنسی تصانیف، اور دیگر اہم متون کو اردو میں منتقل کرنے کے عمل کو مزید وسعت دی۔

اس اکائی میں ہم اردو ترجمے کے ممتاز اداروں کا جائزہ لیں گے، جنھوں نے مختلف ادوار میں اردو زبان کو دنیا کے مختلف ادب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان اداروں کی سرگرمیاں اور ان کی کامیابیاں نہ صرف اردو ترجمہ نگاری کے میدان میں سنگ میل ثابت ہوئیں بلکہ انھوں نے ایک ثقافتی اور علمی پل کے طور پر اردو زبان کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ ہم ان اداروں کی ابتدائی کوششوں سے لے کر موجودہ دور تک کے اہم اداروں اور ان کی سرگرمیوں کا تجزیہ کریں گے تاکہ ان کے اثرات اور اہمیت کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

10.3 اردو ترجمہ کے ممتاز ادارے (ابتدا تا حال)

10.3.1 ترجمہ کے ابتدائی نقوش

عزیز طلبہ و طالبات! ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال آتا ہے کہ ترجمہ ہے کیا؟ اس کی تعریف، فن اور روایت کیا ہے؟ اس سے متعلق آپ نے گذشتہ اکائی میں تفصیلی مطالعہ کر لیا لیکن یہاں ترجمہ کی روایت کا مختصر ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ہم ترجمہ کے ابتدائی مرحلے سے واقف ہو جائیں گے۔ آیئے ہم اس سبق کا آغاز مغلیہ دور سے کرتے ہیں۔ جب مغل ہندوستان آئے، تو انہیں مقامی لوگوں سے رابطے بنانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ وہ یہاں کے سماجی اور سیاسی نظام کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اس وقت حکومتی معاملات کو چلانے کے لیے ضروری تھا کہ

حکومتی احکامات کو رعایا تک پہنچایا جائے اور ان کا ردعمل جانا جائے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر مختلف زبانوں میں تراجم کیے گئے، جن میں فارسی اور دیگر مقامی زبانوں کا اہم کردار تھا۔

مغل بادشاہوں نے نہ صرف سرکاری معاملات کے لیے ترجمہ کرایا بلکہ ہندوستان کے مقامی ادب پر بھی توجہ دی۔ اکبر بادشاہ کے دور میں بہت سے ہندو، جو فارسی زبان جانتے تھے، ان کے ساتھ مل کر اس کام میں حصہ لیتے تھے۔ اکبر کو سنسکرت زبان سے خاص لگاؤ تھا اور اس کے ذریعے کئی اہم کتابوں کے تراجم فارسی میں کیے گئے۔ ان میں سے ایک اہم مثال 1574ء میں ملا عبدالقادر بدایونی کا ترجمہ ہے، جس میں سنگھاسن بتیسی کو ''خرد افروز'' کے نام سے ترجمہ کیا گیا تھا۔

اسی طرح 1575ء میں ایک پنڈت، بہاون نے ''اتھرو وید'' کا ترجمہ شروع کیا، لیکن وہ اس کو مکمل نہ کر سکے۔ اس کے بعد فیضی اور حاجی ابراہیم تھانیسری نے بھی کوششیں کیں، لیکن ان کے تراجم بھی مکمل نہ ہو سکے۔ 1586ء میں ملا عبدالقادر بدایونی نے ''تاریخ کشمیر'' کا فارسی ترجمہ کیا، اور 1591ء میں اکبر کے دور میں ''مہا بھارت'' کا فارسی ترجمہ بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ ''لیلاوتی''، ''نل دمن''، ''تاجک'' اور ''ہری ہنس'' جیسے اہم متون کے تراجم بھی ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند میں ترجمہ نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ روایت تقریباً پندرھویں صدی کے نصف آخر میں اپنی ابتدائی شکل میں نظر آتی ہے۔ اسی لیے یہ مانا جاتا ہے کہ یہی دور، اردو زبان کے آغاز اور ارتقا دونوں لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ایک عام رائے یہ بھی ہے کہ سولھویں اور خصوصاً سترھویں صدی کا زمانہ جنوبی ہند میں، عہدِ زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ اس زمانے میں ترجمہ نگاری اور اردو زبان دونوں حوالے سے ایسے ایسے شاہ کار تخلیق ہوئے کہ جن کی اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔ اس دور میں تمام تراجم مشرقی زبانوں سے کیے گیے جن میں فارسی، عربی، سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''ترجمے کا کام صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا، دوسری ہجری کے وسط میں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کے ہندُستان سے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے؛ ۷۷۰ء میں سندھ سے ایک وفد خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں گیا تھا۔ اس وفد میں ایک ایسے پنڈت بھی شامل تھے جو ہئیت اور ریاضیات کے ماہر تھے۔ یہ پنڈت اپنے ساتھ ہئیت کی مشہور کتاب 'سدھانت' لے گیا تھا۔ خلیفہ کو جب اس کتاب کے مندرجات کا علم ہوا تو اس نے اپنے دربار کے ایک ریاضی دان ابراہیم فرازی کو حکم دیا کہ وہ اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرے جو پنڈت اپنے ساتھ یہ کتاب لے کر بغداد گیا تھا اسے علم ہئیت میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے بہت عزت حاصل ہوئی۔ بغداد کے دو عالم اور ماہر ہئیت ابراہیم فرازی اور یعقوب بن طارق پنڈت کے شاگرد ہو گئے، ان

> دونوں شاگردوں نے اپنے اپنے طریقے سے ’سدھانت‘ کے بنیادی اصولوں کو عربی میں منتقل کیا۔ ہئیت کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں۔ ایک ’کلیلہ دمنہ‘ اور دوسری ’بوزاسف و بلوہر‘۔ کلیلہ دمنہ ’پنچ تنتر‘ کا ترجمہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساسانیوں کے عہد میں ان دونوں کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کی بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں عربی سے ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔‘‘

اردو زبان میں ترجمہ نگاری کے حوالے سے سب سے پہلی کتاب ’نشاۃ العشق‘ ہے۔ یہ ایک صوفی بزرگ عبداللہ حسینی (جو حضرت بندہ نواز گیسودراز کے پوتے تھے) نے اردو میں ترجمہ کی، لیکن اس سے بھی بعض محققین سخت اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ کہنا اور ثابت کرنا قدرے مشکل ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ کون سا ہے۔ ان کے خیال میں شاہ میراں جی خدا نما نے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ’تمہیداتِ ہمدانی‘ کا عربی سے اردو میں جو ترجمہ کیا تھا، وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔ بعض اس کو بھی نہیں مانتے ان کے خیال میں ملا وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف ’دستور عشاق‘ کا اردو میں ترجمہ ’سب رس‘ کے نام سے کیا۔ 1704ء میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف ’معرفت السلوک‘ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے شروع میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ’طوطی نامہ‘ کا ترجمہ ہوا۔ تقریباً اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ’روضۃ الشہدا‘ کا اردو ترجمہ ’کربل کتھا‘ کے نام سے کیا۔ ان ترجموں کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ کوئی باقاعدہ ترجمے نہیں، بلکہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمے ہوتے تھے اور ماہرین کے نزدیک ان ترجموں میں ان سائنسی اصولوں کی پابندی نہیں کی گئی جو اچھے ترجموں کے لیے از بس ضروری ہے۔ دیکھا جائے تو عادل شاہی دور میں بھی ترجمہ نگاری خوب پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔ اس دور کے اہم شاعر رستمی کی نظم ’خاور نامہ‘ دراصل ایک فارسی نظم کا ترجمہ ہے۔ مگر رستمی نے کمال خوب صورتی اور مہارت سے ترجمہ کر کے اسے اپنا بنا لیا۔ اس کا زمانہ تصنیف 1449ء ہے۔ اسی طرح اس عہد کے ایک دوسرے شاعر ملک خوشنود کی مثنوی ’ہشت بہشت‘ خاصی مشہور ہے۔ یہ نظم امیر خسرو کی فارسی نظم پر مشتمل ہے۔ پھر مقیمی جو فارسی شاعر تھا نے ایک ہندی لوک کتھا ’چندر بدن مہیار‘ بڑے دل کش اسلوب میں لکھی ہے۔ 1554ء میں علی عادل شاہ ثانی برسر اقتدار آیا اس کے عہد میں بیجاپور کے باکمال شاعر نصرتی کے ڈنکے بجے۔ مثنوی کی ہئیت میں اس کی تین کتابیں بہت مشہور ہوئیں، جن میں سے گلشنِ عشق اور علی نامہ کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔ بیجاپور کے ایک نابینا شاعر ہاشمی کی تصنیف یوسف وزلیخا جو ایک آزاد ترجمہ ہے وہ بھی ایک اہم چیز ہے۔ اسی طرح قطب شاہی دور میں ترجمہ نگاری پر اچھا وقت رہا۔ اس دور میں ملا وجہی، محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا بہت اعلیٰ پائے کا نثر نگار اور شاعر تھا۔ 1635ء

میں ملاوجہی نے اپنی شہرہ آفاق 'سب رس' ترجمہ کی۔اس کا اسلوب مقفیٰ ہونے کے باوجود سادہ و پرکار ہے۔اس ترجمہ کو دیکھ کر ڈاکٹر سید عابد حسین عابد لکھتے ہیں:

''ترجمے کو ادبی قدر و قیمت اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہ آب ورنگ، وہ چاشنی، وہ خوشبو، وہ مزا بھی آجائے، جو اصل عبارت میں موجود تھا۔''

قطب شاہی دور کا ایک اور بڑا شاعر غواصی تھا۔اس کا مقام ملک الشعراء جیسا تھا۔اس کی مشہور تصنیف سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ 1361ء میں لکھی گئی۔طرزِ بیان میں سادگی اور کمال کی روانی ہے۔اس دور کا ایک اہم شاعر ابنِ نشاطی ہے۔اس کی مثنوی پھول بن دکنی اردو کے خزینہ ادب کا ان مول رتن کہلاتی ہے۔'پھول بن فارسی تصنیف پر مشتمل ہے، لیکن شاعر کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت اور فن کاری نے، اس داستان کی پے چیدہ کہانی کو اپنا بنا لیا ہے۔عیسائیوں نے جب ہندوستان میں تاجروں کے بھیس میں قدم رکھا تو ان کے مبلغین نے اپنی مذہبی کتابیں ترجمہ اور تالیف کر کے شائع کیں۔اٹھارویں صدی کے وسط میں انھوں نے عیسائیت کے پرچار اور فروغ کے لیے توریت اور انجیل کے اردو ترجمے شائع کیے۔

اٹھارہویں صدی کے خاتمے سے کچھ پہلے دلی میں قرآن شریف کے دو ترجمے ہوئے۔یہ مشہور بزرگ شاہ ولی اللہ کے دو صاحب زادوں مولانا شاہ رفیع الدین اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے کیے۔دونوں ترجموں میں ۹ سال کا فرق ہے۔شاہ رفیع الدین کا لفظی ترجمہ تھا، اس میں ہر لفظ کا اس طرح کیا گیا کہ اردو فقروں کی ساخت بالکل بدل گئی۔ چوں کہ سلاست اور روانی نہ تھی، اس لیے اس کا اصل مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ یہ ترجمہ 1768ء میں ہوا تھا۔شاہ عبدالقادر کا ترجمہ 1795ء میں ہوا، پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسان، شگفتہ، سلیس اور رواں تھا۔ان تراجم کا مقصد صرف یہ تھا کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ بھی اس مقدس کتاب کو سمجھ لیں، پڑھ لیں۔ یہ ابتدائی مساعی ادبی نہیں تاریخی زمرے میں زیادہ شمار کی جاتی ہے۔ مذہبی کتابوں کے علاوہ 1775ء میں فارسی داستان 'قصہ چہار درویش' کا ترجمہ حسین عطا تحسین نے کیا۔اصل میں اس کے مصنف محمد معصوم تھے۔کتاب کا نام 'نوطرز مرصع' ہے۔تحسین فارسی کی کئی کتابوں کے مصنف تھے، لیکن اردو ادب میں اس ترجمے کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔اس دور کی ایک کتاب 'بہادر نامہ' بھی ملتی ہے، جس میں سرنگا پٹم کی تاریخ ٹیپو سلطان کی جنگ تک جاتی ہے۔خیال ہے کہ یہ بھی کسی فارسی تصنیف کا حصہ یا ترجمہ ہے۔اس طرح پنڈت دیا شنکر کول کا نام ان کی تصنیف 'گلزارِ نسیم' کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ یہ مثنوی لکھنوی طرزِ تحریر کی نمائندہ مانی جاتی ہے۔ پنڈت جی نے 'لیلہ والف لیلہ' کی کچھ کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا، مگر لازوال شہرت ان کی مترجمہ مثنوی گلزارِ نسیم کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ یہ بہت طویل مثنوی پنڈت جی کے استاد آتش کے کہنے پر مختصر ہوئی۔اس مثنوی کا

اردو ادب میں جو مقام و مرتبہ ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

اردو ادب کے طالب علموں کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ اقبال کی کئی شہرہ آفاق نظمیں بھی غیر ملکی ادب سے اخذ شدہ ہیں۔ ان میں 'ماں کا خواب، بچے کی دعا، 'ایک مکڑی اور مکھی، ایک گائے اور بکری، ایک پہاڑ اور گلہری (ماخوذ از ایمرسن) ہمدردی (ماخوذ از ولیم کوپر) آفتاب (ترجمہ، گایتری) پیامِ صبح (ماخوذ از لانگ فیلو) عشق اور موت (ماخوذ از ٹینی سن)، رخصت اے بزمِ جہاں (ماخوذ از ایمرسن)' وغیرہ۔ آیئے اب ہم ترجمہ کے ممتاز اداروں سے خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

10.3.2 فورٹ ولیم کالج

انگریز ملازموں کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے ۴ مئی ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس میں ہندوستانی زبان کے شعبے کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے بندو بست کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ بھی کھولا اور کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک دارالاشاعت قائم کیا۔ یہیں میر امن نے نوطرز مرصع کا تتبع کرتے ہوئے باغ و بہار کی تالیف کی اور فارسی کی ایک مشہور کتاب اخلاق محسنی کا ترجمہ گنج خوبی کے عنوان سے کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی، آرائش محفل اور گل مغفرت لکھی جو درحقیقت مختلف کتابوں کے ترجمے اور خلاصے ہیں۔ 1801 میں لکھی گئی طوطا کہانی میں محمد قادری کی طوطی نامہ کو آسان بول چال کی مروجہ زبان میں لکھا گیا۔ یہ سنسکرت کی ایک پرانی کتاب پر مبنی ہے۔ آرائش محفل حاتم طائی کے فاری قصے کا ترجمہ وخلاصہ ہے۔ ملا واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہداء کا ترجمہ حیدری نے 'گل مغفرت' کے عنوان سے کیا۔ فارسی کی اس کتاب کا ترجمہ ان سے قبل فضلی نے کربل کتھا کے عنوان سے کیا تھا۔ میر شیر علی افسوس نے فورٹ ولیم کالج میں گلستان سعدی کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے کیا۔ ان کی دوسری کتاب منشی سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ ہے، جو انھوں نے آرائش محفل کے عنوان سے کیا۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان کو نثر میں لکھا اور اسے 'نثر بے نظیر' کے نام سے شائع کیا۔ اخلاق ہندی کے قصے سنسکرت کی کہانیوں پر مبنی ہیں جو اردو میں انھوں نے فارسی سے منتقل کئے۔ انھوں نے تاریخ آسام کا بھی فارسی زبان سے ترجمہ کیا۔ یہیں مظہر علی خاں ولا نے کئی مشہور کتابیں تالیف کیں جو سب کی سب برج اور فارسی زبان سے لی گئی ہیں۔ یہ ہیں: مادھونل، کام کنڈلا، بیتال پچیسی اور تاریخ شیر شاہی۔ مرزا کاظم علی جواں نے کالی داس کی ابھگیان شکنتلم کا اردو میں ترجمہ برج بھاشا کی مدد سے کیا اور شکنتلا ناٹک عنوان رکھا۔ نہال چند لاہوری نے عزت اللہ بنگالی کے قصہ گل بکاؤلی کو اردو میں منتقل کیا اور اس کا نام مذہب عشق رکھا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی بار شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ مولوی اکرام علی، بنی نرائن جہاں، مولوی امانت اللہ شیدا، مرزا جان طپش اور مرزا محمد فطرت نے بھی فورٹ ولیم کالج میں اہم تراجم کیے۔ فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی ترجموں کا کام ہو رہا

تھا۔ میر کے ایک رشتے دار محمد حسین کلیم نے تصوف کی ایک مستند کتاب فصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انوار سہیلی کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے فقیر محمد خاں گویا نے 1838ء میں کیا۔ اس میں پنچ تنتر اور ہتو پیش کی کہانیاں ہیں۔ ان کے چند سال بعد ہیم چند کھتری نے فارسی کی ایک کہانی کا ترجمہ قصہ گل صنوبر کے نام سے کیا۔ اس زمانے میں ترجمے کا کام تیزی سے کیا جارہا تھا لیکن طباعت کی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ اس لیے اندازہ ہے کہ بہت سے تراجم ضائع ہو گئے ہوں گے۔

10.3.3 ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی:

ورناکلر سوسائٹی کا قیام دہلی کالج میں اردو ذریعہ تعلیٰ کے تدریسی مواد یا نصاب کی ضرورت کی وجہ سے عمل میں آیا۔ یہ سوسائٹی 1842ء میں قائم ہوئی اور غدر سے پہلے اس نے 11 کتابیں ترجمے اور تصنیف و تالیف کے ذریعے تیار کر لی تھیں۔ اس سوسائٹی نے ریاضی، سائنس، نجوم، منطق اور فلسفے کو اپنے ترجموں کے منصوبوں میں شامل کیا۔ زیادہ تر ترجمے انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں سے کرائے گئے۔ ان تراجم کی بدولت اردو کے طالب علموں نے مغربی علوم و فلسفے سے براوراست واقفیت حاصل کی۔ مادری زبان میں تعلیم دین کا تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ ریاضی نیچرل سائنس، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ کے شعبوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے طلباء انگریزی والوں پر سبقت لے جانے لگے تھے۔ تاریخ جغرافیہ سائنس علم کیمیا، نباتات علم جراحی علم تمدن علم معاشرت وغیرہ پر ان طالب علموں کے لیے اردو میں کتابیں فراہم ہیں ہیں۔ ان کی ضرورت کے پیش نظر ایک اشاعتی انجمن قائم کی گئی جس کا کام ملکی زبانوں میں ان علوم کی کتابیں شائع کرنا تھا۔ ان لوگوں میں جنھوں نے ورناکلر ٹرانسلیشن کو فروغ دینے میں بڑی کوششیں کیں مسٹر فلکس بترو (Boutros) ڈاکٹر اشپرنگر (Alios Sprenger) منشی کریم الدین مولوی ذکاء اللہ ماسٹر رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرساد، پیارے لال آشوب، ہردیو سنگھ اور ڈاکٹر ضیاء الدین قابل ذکر ہیں۔ مسٹر رام چند اور مولانا صہبائی اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اس ادارے کی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر آگرہ لکھنو میں بھی اس قسم کی کتابیں شائع کرنے کے ادارے قائم کیے گئے۔ اس سوسائٹی نے جو کتابیں ترجمہ کروا کے شائع کیں ان میں چند یہ ہیں: رامائن، مہابھارت، دھرم شاستر، شکنتلا اور رگھوونش، تاریخ انگلستان، تاریخ یونان، تاریخ روم، رسالہ اصول حساب، مبادیات تفرقی احصاء و تکمیلی احصاء، روشنی کا انعکاس اور اجتماع شعاع، تجرباتی جیومیٹری، ہائڈرو اسٹیٹک، حرارت اور برقیات وغیرہ۔ اس ادارے نے ترجمے کے اصول اور قواعد و ضوابط بھی مقرر کیے تھے۔ زبان کو سادہ اور کارآمد بنانے کا جو کام فورٹ ولیم کالج میں شروع ہوا تھا وہ دہلی کالج میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ دہلی کالج میں فروغ پانے والی نثر دراصل فورٹ ولیم کالج اور سرسید کے زیر اثر وجود میں آنے والی نثر کے درمیان کی کڑی ہے۔

10.3.4 سائنٹفک سوسائٹی

سرسید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد 1864ء میں غازی پور میں پڑی۔ بعد میں اس کا دفتر سرسید کے تبادلے کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگیا۔اس ادارے کا بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کر کے نئی فکر اور نئے علوم سے قوم کو روشناس کرانا تھا۔ ہندوستانی زبانوں میں نئے علوم کا ترجمہ کرنا ویسے بھی سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔سوسائٹی نے پچاسوں کتابوں کی فہرست تیار کر کے ترجموں کے لیے منظور کی لیکن اس کے تمام منصوبے پورے نہ ہوسکے۔مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں لیکن ڈاکٹر اصغر عباس نے تحقیق کر کے اپنے مضمون سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم میں یہ لکھا ہے کہ اس سوسائٹی نے صرف پندرہ کتابیں شائع کیں جن میں سے ہمیں گیارہ دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ہیں مصر کی قدیم تاریخ، تاریخ چین، یونان کی قدیم تاریخ حصہ اول، دوم اور سوم، رسالہ علم فلاحت جس میں فرنگستان کے طرز پر کاشتکاری کے فن کا بیان ہے، رسالہ انتظام مدن، تاریخ ہندوستان، رسالہ علم برقی، اصول سیاست مدن اور تاریخ ایران حصہ اول۔ جو کتابیں سوسائٹی نے چھاپیں لیکن دستیاب نہیں ہیں، یہ ہیں: رسالہ علم جغرافیہ حصہ اول تا چہارم، رسالہ جرثقیل اور رسالہ مسائل معادلات۔ترجموں کی اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی نے تاریخ کے تراجم میں زیادہ دلچسپی لی۔ان کتابوں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ حواشی کی مدد سے متن کے اشارات اور اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی تھی۔ یہ ترجمے سلیس اور سادہ زبان میں ہیں۔

10.3.5 دارالترجمہ عثمانیہ

26 اپریل 1917ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی کارروائی شروع کرنے کا فرمان جاری ہوا۔ 1919 میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور یہ طے پایا کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ کے نصاب کے لیے اردو میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ سامنے تھا اس لیے یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی ترجموں کی ضرورت پیش آنے لگی۔مختلف سائنسی اور جدید علوم کی کتابوں کے لیے اردو اصطلاحات کا مسئلہ بھی درپیش تھا، اس لیے یونیورسٹی کے قیام سے دو سال پہلے یعنی 14 اگست 1917ء کو دارالترجمہ قائم کرنے کا فرمان جاری ہوا اور یکم ستمبر 1917ء کو مولوی عبدالحق کی نظامت میں شعبہ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا اور کام کرنا شروع کیا۔ نصاب اور ترجمے کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کئی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ مثلاً وضع اصطلاحات کی کمیٹی، اہل علم و فن کی کمیٹی، انتخابات نصابات کی کمیٹی نظر ثانی کمیٹی اور مذہبی اور ادبی نقطہ ہائے نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹیاں وغیرہ۔ اس دارالترجمہ کے ناظم مولوی عبدالحق تھے۔ چند ممتاز مترجمین جو اس ادارے سے وابستہ رہے یہ ہیں: پروفیسر ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں حکیم کبیر الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، سید ابوالخیر مودودی عبد الباری ندوی اور مرزا لبیب وغیرہ۔ دارالترجمے میں پہلے ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لیے کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آنے کے بعد بھی ڈگری کورسوں مثلاً قانون ہوشیالوجی، طب یونانی میڈیسین،

انکلینیر تک، ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ دارالترجمہ نے 1917ء سے 1948ء تک مسلسل کام کیا۔ 1950ء میں جب یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم انگریزی کو قرار دے دیا گیا تو پھر دارالترجمہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کتابوں کے ترجموں کے علاوہ دارالترجمہ میں اہم ترین کام وضع اصطلاحات کا ہوا۔ یہاں اصطلاحات کو وضع کرنے کے لیے باقاعدہ اصول مقرر کیے گئے۔

کچھ اور بھی ایسے ادارے ہیں جنھوں نے سائنسی، طبی اور علمی کتابوں کے تراجم کے گراں قدر کام انجام دیے۔ کشمیر میں مہاراجہ رنبیر سکھ کا دارالترجمہ اسی قسم کا ایک ادارہ ہے۔ اس ادارے نے زیادہ تر طبی کتابوں کے تراجم کرائے۔ حیدرآباد میں نواب فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی نے سائنسی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

10.3.6 دارالترجمہ شمس الامرا (حیدرآباد)

نواب فخر الدین خاں شمس الامرا نے محلّہ جہاں نما کی ایک حویلی میں اسے قائم کیا جہاں ہندو، مسلمان، انگریز اور فرانسیسی علما ترجمے کا کام کرتے تھے۔ نواب صاحب کو سائنس اور دوسرے جدید علوم سے بڑی دلچسپی تھی اس لیے 1833ء سے 1877ء کے عرصے میں یہاں سے 37 کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ مقطع الارض، علم ہندسہ، علم ہیئت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر علم برق وغیرہ اہم کتابوں کے نام ہیں۔

10.3.7 نوابین اودھ کے زیر اہتمام علمی وفنی تراجم

اودھ کے نواب نصیر الدین حیدر نے انگریزی سے اردو میں سائنسی کتابوں کا ترجمہ کروانے کے لئے ایک انگریز مقرر کیا تھا۔ ان کے بعد محمد علی شاہ اور پھر امجد علی شاہ نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ 1833ء سے 1935ء کے درمیان متعدد کتابیں ترجمہ کی گئیں جن میں مفتاح الافلاک، رسالہ ہیئت، مقاصد علوم، رسالہ مقناطیس وغیرہ اہم ہیں۔

10.3.8 مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دارالترجمہ (جموں وکشمیر)

مہاراجہ نے 1850ء میں دارالترجمہ قائم کر کے ڈوگری، ہندی، پنجابی اور اُردو میں مختلف علوم کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ علم طب سے ترجمہ کی گئی کتابوں کے علاوہ جدید میڈیسن، کاغذ سازی، انجینئرنگ، فوجی فنون، آلات، احرب اور مذہبیات وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں۔

10.3.9 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

اس کا پہلا نام ترقی اُردو بیورو تھا۔ یہاں خاصی تعداد میں علمی وفنی کتابوں کے ترجمے کرائے گئے۔ ان میں تاریخ، سائنس، جغرافیہ، علم کیمیا، گھریلو سائنس، ٹیکنالوجی، ریاضی، زراعت، سماجیات، سیاسیات، طب، کمپیوٹر سائنس، فلسفہ، فنون لطیفہ، لائبریری سائنس اور معاشیات وغیرہ اہم ہیں۔

10.3.10 ترجمہ نگاری میں دارالمصنفین کی خدمات

دارالمصنفین اعظم گڑھ کا شمار ہندوستان کے انتہائی اہم علمی اداروں میں ہوتا ہے، یہ ادارہ صرف علامہ شبلی مرحوم کے

خوابوں کی تعبیر ہی نہیں بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی علمی کاوشوں اور مولانا مسعودعلی ندوی کی عملی جدوجہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہے۔ایک صدی قبل جب اس کی تاسیس ہوئی تو مسلمانوں کا ایسا کوئی دوسرا ادارہ پورے ہندوستان میں موجود نہیں تھا،اپنی تاسیس کے بعد اس ادارے نے جس طرح مصنفین کی متعدد نسلوں کی تربیت کی اس کو بھی اس کی انفرادیت اور اولیت میں شمار کرنا چاہیئے۔دارالمصنفین سے وابستہ قلمکاروں نے متعدد اور متنوع موضوعات پر کام کیا۔ان میں ادب بھی ہے،تاریخ وتذکرہ نگاری بھی ہے اور اہم کتابوں کا اردو، ہندی وانگریزی میں ترجمہ بھی شامل ہیں۔

''رحمت عالم، سیرت حضرت عائشہؓ، خطبات مدارس، عرب وہند کے تعلقات، دین رحمت، مسلمان حکمراں کی مذہبی رواداری (تین حصے)، طبقات الامم، افکارعصریہ، الرسالۃ المحمدیہ، اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' سمیت متعدد کتابوں کے ترجمے ترجمے دارالمصنفین نے شائع کیئے۔ان میں ان میں وہ کتابیں بھی ہیں جن دارالمصنفین سے وابستہ اہل قلم نے تصنصف کیں جن کا انگریزی یا ہندی میں ترجمہ ہوا اور وہ کتابیں بھی ہیں جو عربی وانگریزی میں تھیں جن کا اردو میں ترجمہ کرکے عوام کے استفادہ کے لئے شائع کیا گیا۔

مثال کے طور پر افکارعصریہ چارلس آرگبس ایف آرایس ای کی تصنیف نے جسے محمد نصیراحمد عثمان نیوتنوی نے اردو کا جامہ پہنایا جبکہ ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' ندوۃ العلماء کے سابق ناظم حکیم عبدالحی حسنی کی عربی تصنیف الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کا اردو ترجمہ ہے۔یہ ترجمہ مولانا ابوالعرفان خاں ندوی نے کیا ہے۔

'اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں' کے پیش لفظ شاہ معین الدین احمد ندوی تحریر کرتے ہیں:

> ''یوں تو ہندوستان کی فارسی تاریخوں اور تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں علماء کے ذکر میں ان کی تصانیف کے نام بھی ملتے ہیں لیکن فہرست ابن ندیم، مفتاح السعادۃ اور کشف الظنون کے طرز کی ہندوستانی علماء ومصنفین کی تصانیف کی کون جامع اور مرتب فرست نہ تھی جس میں ایک جگہ ساری تصنیفات مل جائیں اور یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا جس کی نظر ہندستان مسلمانوں کی پوری علمی تاریخ پر ہو علماء میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی نظر اس پر بڑی وسیع اور گہری تھی جس پر ان کی عربی تصنیف ''نزہۃ الخواطر'' کی ضخیم جلدیں شاہد ہیں۔ان کے ذوق میں عجیب تنوع تھا۔ایک طرف انھوں نے نزہۃ الخواطر جیسی بلند پایہ علمی کتاب لکھی جو تراجم کی قدیم عربی کتابوں کی ٹکر کی ہے دوسری طرف گل رعنا لکھی جو اردو شعروادب کی بنیادی کتابوں میں ہے۔چنانچہ انھوں نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے عربی میں ہندوستانی علماء ومصنفین کی تصانیف کی ایک فہرست مرتب کی تھی جو کئی سال ہوئے شام کے مشہور

علمی ادارے المجمع العلمی العربی کی جانب سے دمشق سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ تنہا کتابوں کی فرست نہیں ہے بلکہ اس کے ضمن میں ہندوستانی مسلمانوں کی پوری علمی، تعلیمی اور ذہنی وفکری تاریخ آ گئی ہے۔ ضرورت تھی کہ عام افادہ کے لئے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جائے۔ دارالمصنفین نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی اور اب اس کو اردو کے لباس میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ خدمت عزیز گرامی مولوی ابوالعرفان ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلما نے جو خود اچھا تاریخی ذوق رکھتے ہیں اور ہندوستان کی تاریخ سے ان کو خصوصی دلچسپی ہے سلیقہ اور قابلیت کے ساتھ انجام دی۔ وہ ہمارے سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔''

10.4 ماحصل

عزیز طلبہ وطالبات، اردو ترجمے کی روایت اور اس کے فروغ میں مختلف اداروں نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ ہماری زبان اور ادب کی تاریخ میں سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ فورٹ ولیم کالج وہ پہلا ادارہ تھا جس نے اردو میں ترجمے کی بنیاد رکھی اور مختلف زبانوں کے ادب کو اردو میں منتقل کر کے ہماری زبان کو ایک نئی جہت دی۔ دہلی کالج اور ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اسی روایت کو آگے بڑھایا اور سائنسی، ادبی، اور تعلیمی مواد کو عام قارئین تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ ادارے صرف ترجمے کے مراکز ہی نہیں تھے بلکہ وہ علمی اور ادبی تحریکوں کا مرکز بھی تھے، جنہوں نے زبان کی ترقی میں انقلاب برپا کیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ جیسے اداروں نے اسلامی تاریخ، فلسفے اور علوم کو اردو میں منتقل کیا، تاکہ عام قارئین بھی ان موضوعات سے مستفید ہو سکیں۔ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی نے سائنسی اور طبی موضوعات پر تراجم کر کے اردو کو جدید علوم سے ہم آہنگ کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ لائبریری اور سائنٹفک سوسائٹی جیسے ادارے بھی اپنی جگہ بہت اہم ہیں، جنہوں نے مغربی اور مشرقی زبانوں کے علمی خزانے کو اردو میں منتقل کرنے کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان تمام اداروں کی کوششوں کا ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان نہ صرف ایک ادبی زبان کے طور پر ابھری بلکہ یہ ایک ہمہ گیر علمی زبان بھی بنی، جو فلسفے، سائنس، اور تاریخ جیسے مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ادارے صرف تراجم کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرتے تھے۔ انہوں نے اردو کو ایک ایسی زبان کے طور پر مستحکم کیا جو اپنے قارئین کو دنیا کے بہترین خیالات اور علمی سرمائے تک رسائی دے سکے۔ آج کا دور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا ہے، اور ہمیں انہی اداروں کی تقلید کرتے ہوئے جدید ذرائع کو استعمال میں لانا ہوگا۔ ان اداروں نے جو علمی بنیادیں فراہم کیں، ان پر کام کرتے ہوئے ہمیں اردو زبان کو نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ ترجمہ محض زبان کی تبدیلی نہیں بلکہ یہ ایک تخلیقی عمل ہے جو مترجم سے

گہری بصیرت اور دونوں زبانوں پر مکمل عبور کا تقاضا کرتا ہے۔

10.5 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبہ وطالبات! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- اردو زبان میں ترجمے کی روایت اور اس کی تاریخی بنیادوں کو جانا، خاص طور پر مغلیہ دور سے لے کر جدید دور تک اس کے ارتقاء کے مختلف مراحل کو سمجھا۔
- فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، دارالمصنفین، دارالترجمہ عثمانیہ، اور سائنٹفک سوسائٹی جیسے اہم اداروں کی خدمات اور ان کے کردار کو بخوبی سمجھا۔
- یہ جانا کہ ترجمہ نہ صرف زبانوں کے درمیان معلومات کی ترسیل کا ذریعہ ہے بلکہ یہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان فکری اور علمی تبادلے کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے۔
- اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے علم، سائنس، فلسفہ، اور دیگر موضوعات کی ترقی کا شعور حاصل کیا۔
- ترجمے کے فن کی اہمیت اور اس کی تکنیک کو سمجھا، اور یہ بھی جانا کہ یہ فن کس قدر مہارت اور گہرائی کا متقاضی ہے۔
- مختلف اداروں کے ذریعے اردو میں ترجمے کے فروغ کے تاریخی تناظر کو سمجھنے کے ساتھ یہ ادراک حاصل کیا کہ ترجمہ اردو زبان کی بقا اور عالمی حیثیت کے استحکام کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

10.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ ترجمہ کی تعریف کیجیے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
2۔ ترجمہ کی اقسام اور ہر قسم کی خصوصیات کی وضاحت کیجیے۔
3۔ اردو میں ترجمے کی روایت کیسے شروع ہوئی اور اس میں کن افراد اور اداروں کا اہم کردار رہا؟
4۔ سر سید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ترجمے کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
5۔ اردو میں علمی، سائنسی، اور فکری مواد کے ترجمے کی اہمیت کیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
6۔ ترجمے کے عمل میں کون کون سے چیلنجز پیش آتے ہیں اور ان چیلنجز سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے؟

10.7 فرہنگ

(مشکل الفاظ)	:	(معنی)
ترجمہ	:	ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل۔

روایت	کسی عمل، نظریہ یا طریقے کا ایک تسلسل یا جاری سلسلہ۔
تہذیب	انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک مہذب اور منظّم اظہار۔
ثقافت	کسی معاشرے کے رسم ورواج، عادات، اور علمی وفنی پہلو۔
مترجم	وہ شخص جو ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔
ادب	فنون لطیفہ کے شعبے میں تخلیقی اور فکری اظہار، جیسے شاعری، کہانیاں، اور نثر۔
اہمیت	کسی چیز کی قدر یا خاصیت، جو اسے نمایاں بناتی ہے۔
ارتقاء	ترقی یا تدریجی تبدیلی کا عمل۔
ماخوذ	کسی دوسری جگہ یا ذریعے سے لیا گیا یا متاثر ہوا۔
کلاسیکی	قدیم اور مستند ادب یا فن، جو معیار کا نمونہ ہو۔
چیلنجز	مشکلات یا مسائل جن کا سامنا کیا جائے۔
اصطلاحات	کسی خاص میدان میں استعمال ہونے والے الفاظ یا جملے۔
تکنیک	کسی عمل کو انجام دینے کا مخصوص طریقہ یا مہارت۔
فروغ	ترقی یا وسعت کا عمل۔
وسیلہ	ذریعہ یا ذریعہ مواصلت۔
سائنٹفک	علمی یا سائنسی اصولوں پر مبنی۔
ادارہ	ایک منظّم تنظیم یا تنظیمی ڈھانچہ، جو کسی خاص مقصد کے لیے بنایا گیا ہو۔
ثقافتی	کسی معاشرتی گروہ یا قوم کے مخصوص رسم ورواج سے متعلق۔
لغت	الفاظ اور ان کے معانی کا مجموعہ۔
تہذیب	کسی چیز کو بہتر یا منظّم بنانے کا عمل۔

10.8 کتب برائے طالعہ

1۔ اردو ترجمے کی روایت : مرزا حامد بیگ

2۔ ترجمہ روایت اور فن : نثار احمد قریشی

3۔ فن ترجمہ نگاری : خلیق انجم (مرتبہ)

4۔ فن ترجمہ کے اصول : مرزا حامد بیگ

اکائی 11 عالمی سطح پر ترجمے کی روایت واہمیت (اردو کے ابتدائی تراجم)

ساخت :

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 ترجمے کا مفہوم اوراس کی اہمیت

11.4 عالمی سطح پر ترجمے کی روایت

11.5 اردو کے ابتدائی تراجم

11.6 آپ نے کیا سیکھا

11.7 اپنا امتحان خود لیجیے

11.8 سوالات کے جوابات

11.9 فرہنگ

11.10 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبا:

- عالمی سطح پر ترجمے کی اہمیت سے روشناس کرانا
- عالمی سطح پر ترجمے کی تاریخ سے متعارف کرانا
- ابتدائی اردو تراجم سے واقف کرانا

11.2 تمہید

کتابیں علم وادب اور انسان کے ارتقائی سفر کا خزانہ ہوتی ہیں۔انھیں انسانی آدی کا اجتماعی حافظہ بھی کہا

جا سکتا ہے۔علم جب کتابوں کی صورت محفوظ کیا جانے لگا تو پھر وہ کسی ایک شخص یا قوم تک محدود نہیں رہا۔اس اجتماعی اور مشترکہ حافظے اور خزانے سے استفادہ کی صورت یہی ہے کہ ان کتابوں کے تراجم کیے جائیں۔دنیا کی تاریخ اور زبان وادب کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔علوم کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا اور مختلف تجربات ومشاہدات سے استفادہ ترجمے کی قدامت اور ضرورت پر دلالت کرتا ہے۔اس سبق میں ہم اختصار کے ساتھ تراجم کی عالمی تاریخ اور اس کی اہمیت کا مطالعہ کریں گے۔

11.3 عالمی سطح پر ترجمے کی اہمیت

ترجمے کے فن کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب دوسرے خطوں ،ملکوں اور قوموں کے حالات جاننے کے لیے لوگوں نے سفر کرنا شروع کیا۔اس سفر کے دوران وہ مختلف زبانیں بولنے والوں سے روابط ہوتے اور انھیں اپنی بات کسی نہ کسی طور پر سمجھاتے اور ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے۔اسی مفروضے کو ترجمے کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ترجمہ اس دریچے کا حکم رکھتا ہے جس سے جھانک کر ایک زبان کے لوگ دوسری زبانوں کے سرمایے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ترجمے کے ذریعے ہی دنیا کی ترقی اور علم وفن کے میدان میں انسانی حصولیابیاں ہم تک پہنچی ہیں۔اگر قدیم زمانے میں ترجمے سے کام نہ لیا جاتا تو ہم ابھی تک بہت سی چیزوں سے ناواقف ہوتے اور ترقی کے میدان میں میلوں پیچھے ہوتے۔مترجموں نے اپنی کاوشوں سے انسانی علوم کے خزانے میں اضافہ کیا اور اسے مالا مال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ظ انصاری نے درست لکھا ہے کہ سقراط،وی مقناطیس اور افلاطون کی دو ہزار سال پہلے کی کاوشیں روما اور یونان کے کھنڈرات میں دب کر ناپید ہو جاتیں۔یہ عربی زبان کے عالموں کا کارنامہ ہے جنھوں نے ترجموں کے ذریعہ انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک پہنچا دیا۔اسی طرح بوعلی سینا،ابن رشد اور ابونصر فارابی کے علمی اور فنی کارنامے یروشلم،غرناطہ اور بغداد کی جغرافیائی حدود تک محدود رہ جاتے۔یہ لاطینی زبانیں ہی تھیں،جنھوں نے انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔یعنی ترجمہ ہی انسانی علوم وفنون کو ابدیت اور آفاقیت عطا کرتا ہے۔وقت اور حالات کے مطابق ترجمے کے تقاضے مختلف ہو جاتے ہیں لیکن ترجمہ کی اہمیت اور ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ سے آج تک جتنی بھی ترقی ہوئی یا علم وفن میں اضافے ہوئے وہ ساری چیزیں ہم تک ترجمے کی شکل میں ہی پہنچی ہیں۔عہد جدید میں تکنیکی اور سائنسی دریافتیں،ایجادات اور اطلاعات جس برق رفتاری سے سامنے آ رہی ہیں اسی رفتار سے ترجمے کے عمل میں تیزی آئی ہے۔اگر ترجمے کا عمل سست ہو جائے یا منجمد ہو جائے تو انسانی ترقی ایک مخصوص خطے تک سمٹ کر رہ جائے گی۔ترجمہ دراصل علم وفن کو جمہوری بنانے کا عمل بھی ہے کہ اس پر کسی کا اجارہ نہیں رہتا۔اس سیاق میں ترجمے کی اہمیت کا

اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

11.4 عالمی سطح پر ترجمے کی روایت

تراجم کی عالمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اسے تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔(ا) قدیم دور: جب انسان غاروں سے نکل کر دریا کے کنارے آباد ہونا شروع کیا۔ اس دور میں رابطے کے لیے انھیں ایک دوسرے کی بولی سمجھنے کی ضرورت پڑی ہوگی۔ دنیا کی پہلی تہذیب، سمیری، تہذیب قرار دی جاتی ہے جس کا زمانہ 4500 سے 4000 قبل مسیح بتایا جاتا ہے اور یہ لوگ دریائے فرات اور دجلہ کے کنارے آباد تھے۔ اس تہذیب کے لوگوں نے مختلف تجارت کی غرض سے وادی سندھ، مصر، موجودہ اومان اور افغانستان تک کے سفر بھی کیے۔ ان کی اپنی زبان سمیری ہی تھی۔ یہ زبان رفتہ رفتہ 2000 قبل مسیح تک قدیم عکادی زبان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سمیریوں کے پاس لکھے ہوئے لٹریچر کا ایک خزانہ تھا جس کے چند آثار ہی پائے ہیں۔ معلوم تاریخ کا پہلا ترجمہ گیلگامش نامی نظم کی صورت میں سمیری آثار قدیمہ سے دریافت ہوا ہے۔ یہ نظم قدیم سمیری زبان سے عکادی میں ترجمہ ہوئی تھی۔ تاریخ یہ تصدیق کرتی ہے کہ گیلگامش نامی بادشاہ سمیر میں 2700 قبل مسیح میں سب سے پہلے قائم ہونے والی کش خاندان کی باقاعدہ حکومت کا پہلا فرماں روا تھا۔

(۲) ترجمے کی تاریخ کا دوسرا دور 500 قبل مسیح سے 1500 ء کا ہے۔ 500 قبل مسیح میں بدھ بھکشوؤں نے گوتم بدھ کے اقوال کو پالی پراکرت زبان سے سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ یونان کی تاریخ کا سنہری دور بھی یہی عرصہ ہے جس میں سائنسی روایت قائم ہوئی اور مشہور سائنسدانوں، فلسفیوں اور ماہرین طب کی تحقیقات قدیم یونانی زبان سے لاطینی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سقراط، بقراط، ارسطو، اور افلاطون اہم نام ہیں۔ بعد میں یہی تراجم انگریزی میں ترجمہ ہوئے۔

دور مسیح سے 1000 بعد مسیح کا دور مشرق وسطیٰ میں مذاہب کے عروج کا دور ہے۔ عبرانی زبان، عربی زبان بن چکی تھی جو اپنے اندر وسعت، کشادگی اور وسیع ترین ذخیرہ الفاظ رکھتی ہے۔ یونانی اور شامی زبان میں لکھی گئی کتب عربی میں منتقل کی گئیں۔ آٹھویں صدی عیسوی عباسی خلفا کے ذریعہ قائم شدہ دارالحکمت میں فلسفے، طب، فلکیات، ریاضی اور سائنس کے علاوہ دیگر علوم کی متعدد کتب کے تراجم یونانی اور شامی زبان سے عربی زبان میں کیے گئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے انہی تراجم کی وجہ سے مسلم تہذیب کا وہ دور شروع ہوا جو 800ء سے 1300ء تک اپنے عروج پر رہا۔ اس پانچ سو سالہ دورانیے میں ابن سینا، البیرونی، الرازی، الکندی، الفارابی، ابن رشد، ابن الہیثم اور ابوحمید غزالی کے علاوہ متعدد نامور سائنسداں، طبیعات داں، مورخ اور فلسفی پیدا ہوئے۔

(۳) تراجم کی تاریخ کا تیسرا دور گزشتہ پانچ سو سالہ تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس عہد میں ادب، فلسفہ، معاشیات، سماجی اور سائنسی علوم کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے۔ اس دور میں دنیا ایک عالمگیر بستی میں تبدیل ہوئی ہے۔ مختلف قوموں، سماجوں اور تہذیبوں کی زبانیں جانے بغیر ان سے رابطہ ممکن نہ رہا۔ تجارت، سیاست، معاش اور علم وفن کے ساتھ ٹکنالوجی اور نئی ایجادات نے دینا کو ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دیا کہ ایک کا وجود دوسرے کے لیے ناگزیر سا ہوگیا۔ اجنبیت اور نامانوسیت کو بہت دیر تک برداشت کرنا ممکن نہیں رہا۔ اسے دور کرنے کا واحد ذریعہ ترجمہ ہے۔ تجارت کے فروغ، سیاست کے استحکام اور علم وادب کی ترقی میں ترجمہ نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہر ملک ایک دوسرے کی زبان میں کام کرتے ہیں اور اپنی مصنوعات کو اس ملک کی آبادی کی زبان کے لحاظ سے پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج اگر چین کی مصنوعات دنیا بھر کے شہروں میں موجود ہیں تو ایسا اس وقت ہوا جب تیس برس پہلے چینی حکومت نے انگریزی سیکھنے بولنے اور اپنی مصنوعات کا لٹریچر انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت دی۔ یہی صورت حال ہندوستان، جاپان، کوریا، بنگلہ دیشی اور ویتنام کی مصنوعات کی ہے۔ اس کے انفارمیشن ٹیکنالوجی غیر ادبی ترجمے کا ایک موثر ذریعہ بن چکی ہے۔

اسی دور میں ادب کے فروغ کے حوالے سے تراجم نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ روسی، جرمن، عربی، فارسی، چینی، جاپانی، انگریزی اور ہندی ادب کے تراجم نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ پڑھنے والے کا دنیا کو دیکھنے کا نقطۂ نظر تبدیل کرتے ہیں۔ انسان یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک، معاشروں اور تہذیبوں میں تفاوت ہونے کے باوجود انسانوں کے دکھ اور سکھ، خوشی اور غم کے مآخذ، جذبہ محبت وایثار اور احساس و ہمدردی کے جذبات کس قدر یکساں ہیں۔

اس سے زیادہ تراجم کی اہمیت کیا ہوگی کہ تراجم کے بغیر الہامی مذاہب مقامی رہتے، نگر نگر میں وسعت پذیر نہیں ہوسکتے تھے اور دنیا کی آبادی کا حاوی حصہ آج کسی نہ کسی مذہب کا پیروکار ہے، الہامی کتب کے تراجم کے بغیر ایسا ممکن نہ ہوتا۔ مترجم نہ صرف دو تہذیبوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ بلکہ ایک نئی زبان میں نیا ادب بھی تخلیق کرتا ہے۔ اس حوالے سے مترجم کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔

11.5 اردو کے ابتدائی تراجم

اردو میں ترجمے کی روایت اردو زبان کے آغاز سے ہی شروع ہوئی۔ اردو کے ابتدائی نقوش کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ کسی نہ کسی طرح سے فارسی یا عربی متون کے تراجم ہیں گو کہ وہ شعوری طور پر ترجمہ نہیں کیے گئے۔ اردو کی ابتدائی شاعری کے موضوعات و مفاہیم، شاعرانہ تصورات اور خیالات فارسی سے مستعار نظر آتے

ہیں۔اس دور میں اردو کے ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جنھیں فارسی کا ترجمہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔اردو کی کلاسکی نثری اصناف کا بیشتر حصہ ترجمے پر مشتمل ہے۔ ملاوجہی کی سب رس، فضلی کی کربل کتھا، میر عطاحسین خاں کی نوطرز مرصع، میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل وغیرہ بھی ترجمہ ہی کے ضمن میں شمار کی جاتی ہیں۔لیکن انھیں ترجمہ کے جدید تصور کی روشنی میں ترجمہ کہنا درست نہیں ہوگا البتہ انھیں اردو تراجم کا دور اور یا ناتراشیدہ صورت ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو میں باضابطہ ترجمے کا آغاز مذہبی کتب کے تراجم سے ہوا۔مشنری اداروں نے تبلیغ مذہب کی خاطر اپنی مذہبی کتب بالخصوص انجیل کے تراجم مختلف زبانوں میں کرنے لگے تھے۔1748ء میں پادری بنجامن شلز نے انجیل کا اردو میں ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ اسلامی علوم کے ترجمے بھی فارسی اور عربی سے اردو میں کیے جارہے تھے۔ روضۃ الشہدا، ملاواعظ حسین کاشفی کی فارسی تصنیف تھی جو محرم کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھی۔فضلی نے استفادۂ عام کے مقصد سے اسے اردو میں 'کربل کتھا' کے نام سے ترجمہ کیا جو 1732ء میں مرتب ہوئی۔اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں قرآن مجید کے دو ترجمے اردو میں ہوئے۔شاہ رفیع الدین نے 1786ء میں پہلا ترجمہ کیا اور اس کے بعد شاہ عبدالقادر نے 1790ء میں قرآن شریف کا دوسرا ترجمہ پیش کیا۔ اسی دور میں فارسی داستان قصہ چہار درویش کا ترجمہ میر عطا حسین خان نے نوطرز مرصع کے نام سے کیا۔

اردو میں ترجمہ نگاری کا سنہرا دور فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتا ہے جہاں میر امن، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان وغیرہ نے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی مختلف کتابوں کو اردو میں منتقل کیا اور یہاں سے ترجمہ نگاری کو ایک نئی راہ ملی جسے بعد میں مختلف اداروں نے پروان چڑھایا۔جن اداروں نے اردو تراجم کی تاریخ میں اہم کارنامے انجام دیے ان میں دارالترجمہ عثمانیہ، دہلی کالج ورناکلر سوسائٹی، سائنٹفک سوسائٹی، طامسن انجینیرنگ کالج کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

11.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ:

- عالمی سطح پر ترجمے کی اہمیت سے روشناس ہوئے
- عالمی سطح پر ترجمے کی تاریخ سے متعارف ہوئے
- ابتدائی اردو تراجم سے واقف ہوئے

11.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1- عالمی سطح پر ترجمے اہمیت اجاگر کیجیے۔

2- عالمی سطح پر ترجمے دوسرے دور سے متعلق اظہار خیال کیجیے۔

3- اردو کے ابتدائی تراجم کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

11.8 سوالات کے جواب

1- ترجمے کے فن کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب دوسرے خطوں، ملکوں اور قوموں کے حالات جاننے کے لیے لوگوں نے سفر کرنا شروع کیا۔ اس سفر کے دوران وہ مختلف زبانیں بولنے والوں سے ملتے اور انھیں اپنی بات کسی نہ کسی طور پر سمجھاتے اور ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اسی مفروضے کو ترجمے کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ ترجمہ اس دریچے کا حکم رکھتا ہے جس سے جھانک کر ایک زبان کے لوگ دوسری زبانوں کے سرمایے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ ترجمے کے ذریعے ہی دنیا کی ترقی اور علم وفن کے میدان میں انسانی حصولیابیاں ہم تک پہنچی ہیں۔ اگر قدیم زمانے میں ترجمے سے کام نہ لیا جاتا تو ہم ابھی تک بہت سی چیزوں سے ناواقف ہوتے اور ترقی کے میدان میں میلوں پیچھے ہوتے۔ مترجموں نے اپنی کاوشوں سے انسانی علوم کے خزانے میں اضافہ کیا اور اسے مالا مال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ظ انصاری نے درست لکھا ہے کہ سقراط، وی مقناطیس اور افلاطون کی دو ہزار سال پہلے کی کاوشیں روما اور یونان کے کھنڈرات میں دب کر ناپید ہو جاتیں۔ یہ عربی زبان کے عالموں کا کارنامہ ہے جنھوں نے ترجموں کے ذریعہ انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک پہنچا دیا۔ اسی طرح بوعلی سینا، ابن رشد اور ابونصر فارابی کے علمی اور فنی کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کی جغرافیائی حدود تک محدود رہ جاتے۔ یہ لاطینی زبانیں ہی تھیں، جنھوں نے انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔ یعنی ترجمہ ہی انسانی علوم وفنون کو ابدیت اور آفاقیت عطا کرتا ہے۔

2- ترجمے کی تاریخ کا دوسرا دور 500 قبل مسیح سے 1500ء کا ہے۔ 500 قبل مسیح میں بدھ بھکشوؤں نے گوتم بدھ کے اقوال کو پالی پراکرت زبان سے سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ یونان کی تاریخ کا سنہری دور بھی یہی عرصہ ہے جس میں سائنسی روایت قائم ہوئی اور مشہور سائنسدانوں، فلسفیوں اور ماہرین طب کی تحقیق قدیم یونانی زبان سے لاطینی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سقراط، بقراط، ارسطو، اور افلاطون اہم نام ہیں۔ بعد میں یہی تراجم انگریزی میں ترجمہ ہوئے۔

دور مسیح سے 1000 بعد مسیح کا دور مشرق وسطیٰ میں مذاہب کے عروج کا دور ہے۔عبرانی زبان،عربی زبان بن چکی تھی جو اپنے اندر وسعت کشادگی اور وسیع ترین ذخیرہ الفاظ رکھتی ہے۔ یونانی اور شامی زبان میں لکھی گئی کتب عربی میں منتقل کی گئیں۔آٹھویں صدی عیسوی عباسی خلفا کے ذریعہ قائم شدہ دارالحکمت میں فلسفے،طب،فلکیات،ریاضی اور سائنس کے علاوہ دیگر علوم کی متعدد کتب کے تراجم یونانی اور شامی زبان سے عربی زبان میں کیے گئے۔یہ کہا جاسکتا ہے انہی تراجم کی وجہ سے مسلم تہذیب کا وہ دور شروع ہوا جو 800ء سے 1300ء تک اپنے عروج پر رہا۔اس پانچ سو سالہ دورانیے میں ابن سینا، البیرونی، الرازی، الکندی، الفارابی، ابن رشد، ابن الہیثم اور ابوحمید غزالی کے علاوہ متعدد نامور سائنسداں،طبیعات داں،مورخ اور فلسفی پیدا ہوئے۔

3- اردو میں ترجمے کی روایت اردو زبان کے آغاز سے ہی شروع ہوئی۔اردو کے ابتدائی نقوش کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ کسی نہ کسی طرح سے فارسی یا عربی متون کے تراجم ہیں گوکہ وہ شعوری طور پر ترجمہ نہیں کیے گئے۔اردو کی ابتدائی شاعری کے موضوعات و مفاہیم،شاعرانہ تصورات اور خیالات فارسی سے مستعار نظر آتے ہیں۔اس دور میں اردو کے ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جنھیں فارسی کا ترجمہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔اردو کی کلاسکی نثری اصناف کا بیشتر حصہ ترجمے پر مشتمل ہے۔ملاوجہی کی سب رس،فضلی کی کربل کتھا،میر عطا حسین خاں کی نوطرز مرصع،میر امن کی باغ و بہار،حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل وغیرہ بھی ترجمہ ہی کے ضمن میں شمار کی جاتی ہیں۔لیکن انھیں ترجمہ کے جدید تصور کی روشنی میں ترجمہ کہنا درست نہیں ہوگا البتہ انھیں اردو تراجم کا دور اور یا نا تراشیدہ صورت ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

11.9 فرہنگ

لفظ		معنی
مفاہیم	:	مفہوم کی جمع،مطلب،معنی
تصورات	:	تصور کی جمع،سوچ،خیال،فکر
کاوشیں	:	کاوش کی جمع،کوشش

11.10 کتب برائے مطالعہ

فن ترجمہ نگاری	:	خلیق انجم
ترجمے کا فن اور روایت	:	قمر رئیس،

ترجمے کا فن : مرزا حامد بیگ

اکائی 12. اردو میں مفہومیاتی ،semantic ترسیلی،متنی تراجم اور حکائی ترجمے کی

اکائی:12 روایت،اہمیت واطلاق

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 اردو میں مفہومیاتی،ترسیلی،متنی اور حکائی ترجمے

12.3.1 ترجمہ کا اہمیت واطلاق

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

12.5 اپنا امتحان خود لیجئے

12.6 سوالات کے جوابات

12.7 فرہنگ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆اردو میں مفہومیاتی ترجمہ کے بارے میں جانیں گے۔

☆اس اکائی میں آپ متنی اور ترسیلی ترجمے کے بارے میں واقفیت حاصل کریں گے۔

☆اس اکائی کے ذریعے آپ کو حکائی ترجمے کی معلومات حاصل ہوگی۔

12.2 تمہید

دنیا میں کئی زبانیں ہیں اور نہ جانے کتنی بولیاں ہیں۔ظاہر ہے کہ ہر زبان اور بولی کو جاننا ممکن نہیں۔لیکن ہر زبان و بولی میں فرق واحساس کا تخلیقی ادب موجود ہے۔لہذا فکر وادب کے اس خزینے سے لطف اندوز ہونے کے لئے ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ہر زبان اور بولی میں لوک گیت اور سنگیت ،اساطیر، حکایتیں اور داستانیں ، قصے اور کہانیاں اور ہر پل بدلتے ہوئے حالات کے عکس حرکت پذیر ہوتے ہیں۔نیز مخصوص تغیر وتہذیب میں پرورش پاتے ہیں۔اس پس منظر میں مختلف اقسام کے ادب وعلوم مظہر ہوتے ہیں۔دنیا کے مختلف مما لک ان تک

رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان میں ایک کوشش ترجمہ ہے.

12.3 اردو میں مفہومیاتی ترجمے, متنی،ترسیلی،حکائی ترجمے

عام طور پر ترجمے کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ا۔علمی ترجمہ

۲۔ادبی ترجمہ

۳۔صحافتی ترجمہ

ان میں سے ہرایک ترجمہ دوطرح سے انجام دیا جاسکتا ہے۔یہ یا تو لفظی ترجمہ ہوگا یا مفہوم کا ترجمہ۔
علمی تراجم کے ذیل میں تمام سائینسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں جن میں جغرافیہ ،تاریخ،ریاضیات ،معاشیات،قانون ،طبیعات ،میکانیات وغیرہ شامل ہیں۔ادبی ترجمے کے لئے ضروری ہے کہ یہ با محاورہ کیا جائے اور اپنی زبان کے روزمرہ ،ضرب الامثال،تشبیہات،استعمارات وکنایات اور رموز وعلامات سے کام لیا جائے۔جبکہ صحافتی ترجمہ جسے کھلا ترجمہ بھی کہا جاتا ہے یہ مفہوم کے ترجمے کے ذیل میں آتا ہے۔

☆مفہومیاتی ترجمہ:

ترجمے کی تین راہیں ہیں۔ایک لفظی ترجمہ،دوسرا آزاد ترجمہ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان کا ترجمہ،اس تیسرے یا اعتدال کے ترجمے کو ہم تخلیقی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔کیونکہ جب اس کی تمام شرائط پوری ہوتی ہیں تو وہ صرف تقلید یا نقل نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں ایک فنی حسن پیدا ہوجاتا ہے۔وہ اصل کو پوری طرح ذہن وعلم میں اتار کر اسے نئے وجود اور نئی زیب وزینت سے آراستہ کرنے کے برابر ہے۔اور اس طرح بجائے خود تخلیق کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

مفہومیاتی ترجمہ(لفظی ترجمہ) جسے۔ literal Translation یعنی لفظ بہ لفظ ترجمہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی تکنیک ہے۔جس کی مدد سے مترجم اصل متن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔یہ اپنے آپ میں خود ایک مکمل اصول ہے۔چند مثالیں دیکھتے ہیں:

I Left my Spectacles on the table downstairs

This train arrives at Union Station at ten

ا۔میں نے اپنا چشمہ نیچے میز پر چھوڑ دیا ہے۔

۲۔یہ ٹرین یونین اسٹیشن پر دس بجے آتی ہے۔

یہ تکنیک اس وقت زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے جب دونوں زبانیں ایک ہی قبیل کی ہوں۔ایسی صورت میں ترجمہ کرنے میں نسبتا زیادہ آسانی ہوتی ہے۔مثال کے طور پر عربی ،فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنا مقابلتاً آسان

ہے۔اسی طرح ہسپانوی سے فرانسیسی میں ترجمہ کرنا قدرے سہل ہے ۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آرٹکل اور اضافت کا تصوران سب زبانوں میں لگ بھگ یکساں ہے۔اردو سے ہندی کا معاملہ بھی کافی آسان ہے۔ کیونکہ جملوں کی ساخت تبدیل کرنا نہیں پڑتی۔

جے۔پی۔وینے ،اس ضمن میں کہتے ہیں کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ اس وقت کسی حالت میں قبول نہیں ہوگا جب ترجمہ صحیح مفہوم کے علاوہ ،کوئی دوسرا مفہوم پیدا کرے ،کوئی مفہوم پیدا نہ کرے یا جملے کی ساخت تبدیل کرنا ناممکن ہو۔مفہومیاتی ترجمہ کے ضمن میں آنے والے جو تینوں اصول بیان کئے گئے ہیں ان کا استعمال ایک مترجم غیر افسانوی ادب کے ترجمے کے وقت زیادہ استعمال میں لاتا ہے۔جیسے صحافت میں کسی اخبار کا ترجمہ یا کسی مشین یا آلہ کے استعمال کی ہدایات کا ترجمہ وغیرہ۔لیکن ادبی تصانیف کے ترجمے میں لسانی حقائق کے علاوہ لسانیات کے ماورائی حقائق کا ترجمہ بھی درکار رہوتا ہے۔

صحافتی ترجمہ،مفہومیاتی ترجمے کے ذیل میں آتا ہے۔''مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہے۔''ایسے ترجموں میں کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لئے یہ آسانی ہوتی ہے،کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طور پر بیان کردے۔جس فن کا ترجمہ مقصود ہوا گر وہ طویل اور پیچیدہ جملوں پر مشتمل ہو تو لازمی نہیں کہ اس کا ترجمہ بھی اسی طرح طویل اور پیچیدہ جملوں میں کیا جائے۔بہتر ہے کہ اصل مفہوم کو چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں میں ادا کیا جائے۔

عبدالماجد سالک کے نزدیک''اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہوجائے۔تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔اس کے لئے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔اگر اخباری مترجم سادگی،سلاست اور محاورہ اردو کو مدِنظر رکھ کر ترجمہ کرے تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ان کو چاہیے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کردیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لے کہ آیا اصل مطلب ادا ہوگیا ہے۔اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہوگیا ہے تو سبحان اللہ! ورنہ ادھر ادھر کی کمی بیشی کر کے اسے پورا کردیں۔لغت مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے۔''

مذہبی اور قانونی تراجم:

یہاں ہم اپنی بات مغل عہد سے شروع کررہے ہیں۔مغلوں کے عہد میں سرکاری ضرورتوں سے مختلف زبانوں سے فارسی میں اور فارسی سے ان زبانوں میں لازمی طور پر ترجمے ہوتے ہوں گے۔لیکن مغل بادشاہوں نے ہندوستانی ادب کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔عہدِ اکبری میں ایسے ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی،جو فارسی سے بخوبی واقف تھے۔اکبر کو سنسکرت سے بہت لگاؤ تھا۔اس نے سنسکرت سے شاعری،فلسفہ،ریاضی،الجبرا وغیرہ کی

کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے 1574 میں ''سنگھاسن بتیسی'' کا ''خردِ افروز'' کے نام سے ترجمہ کرایا۔ 1575 میں بدایونی نے بھاون نامی ایک پنڈت سے ''اتھر وید'' کا فارسی میں ترجمہ شروع کروایا، لیکن یہ کام پورا نہ ہوسکا۔ شیخ فیضی اور حاجی ابراہیم تھانسیری نے یہ کام مکمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ دونوں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ملا بدایوں نے ''رامائن'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ پھر انہوں نے ''تاریخ کشمیر'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر ہی کے عہد میں کئی علما نے مل کر 'مہا بھارت' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں ''لیلا وتی''، ''نل دمن'' اور ''ہری بنس'' وغیرہ کے ترجمے تیار ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ترجموں کی تیاری میں برہمن اور مسلمان عالم دونوں برابر کے شریک تھے۔

ترجمے کا کام صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا۔ دوسری ہجری کے وسط میں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ 770 ہجری میں سندھ سے ایک وفد خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں گیا تھا۔ اس وفد میں ایک ایسے پنڈت بھی شامل تھے جو ہیئت اور ریاضیات کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ ہیئت کی مشہور کتاب ''سدھانت'' لے گئے تھے۔ خلیفہ کو جب اس کتاب کی مندراجات کا علم ہوا تو اس نے اپنے دربار کے ایک ریاضی داں ابراہیم فراضی کو حکم دیا کہ وہ اس کا عربی میں ترجمہ کرے۔ بغداد کے دو عالم اور ماہر ہیئت ابراہیمفر اضی اور یعقوب بن طارق پنڈت کے شاگرد ہو گئے۔ ان دونوں شاگردوں نے اپنے اپنے طریقے سے ''سدھانت'' کی بنیادی اصولوں کو عربی میں منتقل کیا۔ ہیئت کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں ایک ''کلیلہ و دمنہ'' اور دوسری ''بوزاسف و بلوہر'' کلیلہ و دمنہ یہ پنچ تنتر کا ترجمہ ہے، کہا جاتا ہے کہ عربی میں ان دونوں کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کی بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں عربی سے ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

اردو ادب کے ابتدائی عہد میں بہت بڑی تعداد میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے اردو نثر میں ترجمے کئے گئے۔ یہ ترجمے مذہب، تصوف، شاعری، داستان، ہیئت اور فلسفے کی کتابوں کے تھے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شاہ میراجی نے ابوالفضائل، عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیداتِ ہمدانی'' کا عربی سے اردو میں جو اردو ترجمہ کیا تھا وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ملا وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشا پوری کی فارسی تصنیف ''دستورِ عشاق'' کا اردو میں ''سب رس'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ 1704 میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف '''' معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

اٹھارویں صدی کے اوائل میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہوا۔ تقریباً اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں کربل کتھا کے نام سے ترجمہ کیا۔

ان تر جموں کے بارے میں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ یہ تر جمے نہیں بلکہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد تر جمہ ہوتے تھے۔ان میں تر جمہ نگاری کے ان سائنٹیفک اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی جو اچھے تر جموں کے لئے ضروری ہے۔

عیسائیوں نے جب ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے قدم رکھا تو ان کے مبلغین نے اپنی مذہبی کتابیں تر جمہ اور تالیف کر کے شائع کیں۔اٹھارویں صدی کے وسط میں انھوں نے توریت اور انجیل کے اردو تر جمے شائع کئے۔کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی کتاب، کتاب پیدائش کے پہلے چار بابوں کا تر جمہ ہندوستانی ہے۔جس کا تر جمہ Benjamaain Schultze نے کیا تھا۔اس کے بعد شولٹز نے کتاب دانیال کا اردو جمہ شائع کیا۔ان تمام کتابوں کی فہرست سی۔اے گیریرسن نے اپنی کتاب ''ہندوستان کا لسانی تر جمہ'' جلدنہم میں دی ہے۔

اردو میں قرآن شریف کا پہلا تر جمہ مولانا شاہ رفیع نے کیا۔یہ تر جمہ لفظی تھا۔یعنی قرآن شریف کے ہر لفظ کا اس طرح تر جمہ کیا۔یہ تر جمہ پہلے تر جمے کے مقابلے میں زیادہ سلیس،شگفتہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا تھا۔

☆فورٹ ولیم کالج:

اب تک اردو میں جتنے تراجم ہوئے تھے۔وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔فورٹ ولیم کالج پہلا ادارہ تھا۔جس نے منظّم اور باقاعدہ طریقے پر عربی، فارسی اور سنسکرت سے سے اردو میں تر جمے کئے۔اس کالج میں ہندوستانی زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا۔اس شعبے کے لئے گل کرسٹ کو پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔کالج کے نصاب میں شامل کرنے کے لئے ساٹھ کتابیں تیار کی گئیں۔ان میں تراجم بھی تھے تالیف اور تصنیفات بھی۔تراجم میں پابند تر جمے بھی تھے اور آزاد تر جمے بھی۔فورٹ ولیم کالج میں جن ادیبوں نے اردو میں تر جمے کئے ان کے نام ہیں۔عبداللہ مسکین، کاظم علی جوان، بہادر علی حسینی، مظہر علی خان ولا، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، خلیل علی خان اشک، طوطا رام، میر جعفر، مولوی عنایت اللہ، غلام اکبر، وغیرہ۔

☆دہلی کالج:

فورٹ ولیم کالج کے تراجم دہلی کالج کے تراجم سے بالکل مختلف تھے۔فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لئے تراجم کئے گئے تھے۔جبکہ دہلی کالج میں ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دینے کے لئے بڑے پیمانے پر تر جمے کئے گئے۔

☆دارالتر جمہ عثمانیہ:

نظام حیدرآباد نے 1917 میں شعبہ تالیف و تر جمے کے نام سے دارالتر جمہ قائم کیا۔اس ادارے میں آرٹس کے

تمام مضامین میں ایک ایک اور سائنس کے مضامین میں دو دو مترجمین کا تقرر کیا گیا۔ یہ مترجمین انگریزی، عربی ، فارسی اور اردو پر قدرت رکھتے تھے۔ ان میں قاضی محمد حسین، تلمذ حسین، محمد الیاس برنی، نظم طباطبائی، سید ہاشمی فرید آبادی، سید علی رضا، عبدالحلیم شرر، وحید الدین سلیم، مولوی عنایت اللہ، پروفیسر ضیا الدین انصاری وغیرہ شامل تھے۔ اس ادارے نے کئی کتابیں ترجمہ کروائیں۔

دلی کالج میں جن قانونی اور اصولوں پر مبنی کتابوں کا ترجمہ ہوا ان میں سے چند یہ ہیں۔:

۱۔ تحریر اقلیدس مقالہ

۲۔ اصول قانون

۳۔ تاریخ ہند۔ زمانہ قدیم تا زمانہ حال

۴۔ اصولِ حکومت

۵۔ اصول وقوانین مال گزاری

۶۔ اصول وقوانین اقوام

۷۔ تاریخ انگلستان، گولڈ اسمتھ کی خلاصہ تاریخ کا ترجمہ

۸۔ الجبرا، ترجمہ برجز

۹۔ علم مثلث وتراش ہائے مخروطی

۱۰۔ علم ہندسہ وغیرہ۔۔۔۔

ترسیلی متنی ترجمہ:

اس مرحلے میں مترجم فن پارہ کے معنی ومفہوم اس وجدانی اور تخیلی تجربات اور اثر آفرینی کو قاری کے ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔ یہ مرحلہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔ خود سمجھنے اور تجربے سے گزرنے سے زیادہ دوسروں کو سمجھانا اور تجربے سے آشنا کرانا مشکل ہوتا ہے۔ ترسیل وابلاغ کا یہ مسئلہ تخلیق سے زیادہ ترجمے میں پیچیدہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف الفاظ وخیال کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے۔ جبکہ مترجم مصنف کا پابند ہوتا ہے۔ ایسی دو زبانیں جو اپنی تہذیب ومزاج کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہوتی ہیں۔ کسی حد تک اس مسئلے کو حل کر لیتی ہیں یعنی وہاں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ کوئی لفظ یا ترجمے میں من وعن رکھ لی جائے جیسے فارسی، ہندی، عربی وغیرہ زبانوں سے اردو میں ترجمہ۔ خصوصا یہ مسئلہ شعری ترجمے میں نا قابلِ حل ہوتا ہے۔ انگریزی کی منظوم شاعری کو اردو میں نظم کے اسی اثر کے ساتھ پیش کرنا ناممکن ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے ان دونوں کے صوتیاتی نظام اور عروض آہنگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اسی لئے علامہ شبلی نعمانی نے شاعری کے ترجمے کو شاعری کی موت کے مترادف قرار دیا ہے۔

لسانی نقطہ نظر سے ترجمہ ''متنی ولسانی قلبِ ماہیت'' Metamorphosis ہے یعنی ترجمہ متن کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش ہے۔ ترجمے کی اس کوشش سے تحریر اپنے مخصوص لسانی دائرے سے باہر نکل کر ایک نئے لسانی ماحول میں باہمی مفاہمت کی فضا پیدا کرتی ہے۔ گویا ترجمے کے عمل میں متن کی زبان کی آگاہی اور دوسری زبان میں مہارت ضروری تصور کی جاتی ہے۔ کیونکہ ترجمہ دراصل ''لسانی منتقلی'' ہے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ کسی بھی زبان میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ کلی طور پر کسی متن کی پوری فضا کو ایک زبان سے دوسرے زبان میں منتقل کر سکے۔

متنی ترجمہ تخلیقی، سائنسی اور سماجی علوم کی کیا جاتا ہے لیکن اس کا زیادہ استعمال تخلیقی اور ادبی تراجم میں ہوتا ہے۔ تخلیقی ادب کے ترجمے میں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس صورتِ حال سے تخلیق کار گزرتا ہے اسی صورتِ حال سے مترجم کو گزرنا پڑتا ہے۔ فکری سطح پر بھی اور جذباتی سطح پر بھی۔ بغیر تخلیقی عمل سے گزرے ہوئے ترجمہ محض لفظی ترجمہ بن کے رہ جائے گا۔ مترجم کے لئے زماں و مکاں کی مکمل آگاہی ضروری ہے۔ مترجم کے لئے نہ صرف ماخذ زبان کے محاوروں، ورثے، ادبی تاریخ اور بیانیہ کی قوت کو سمجھنا ضروری ہے، بلکہ ہدفِ زبان میں اسے منتقل کرنے کے لئے مطالعے کی گہرائی و گیرائی بھی اہم ہے۔

سفرنامے، جاسوسی ناول یا جاسوسی ادب، شاعری کا ترجمہ، کسی داستان یا ناول کا من وعن ترجمہ متنی یا ترسیلی ترجمے کے ذیل میں آتے ہیں۔ کربل کتھا، باغ و بہار، دریائے لطافت، سب رس، وغیرہ من وعن ترسیل کئے گئے ادبی نمونے ہیں۔

حکائی ترجمے :

ایسے واقعات اور زبانی روداد جسے سینہ بہ سینہ سنا گیا ہے، تحریری شکل میں بعد کو ترتیب دیا گیا۔ کہانیوں اور واقعات کا وہ سلسلہ جو اخلاقی اقدار پر منحصر ہوتا ہے حکائی ادب کہلاتا ہے۔ ہندوستان کے قدیم افسانوی ادب میں سنسکرت کی ''پنچ تنتر'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اخلاقی حکایتوں کا یہ مجموعہ، جس میں جانور نمایاں کردار ادا کرتے ہیں، مختلف زبانوں اور مختلف زمانوں کے بہت سے حکایتی مجموعوں کا ماخذ ہے۔ روایات کے مطابق نوشیروان کے عہد میں یہ کتاب ایران پہنچی اور پہلوی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا، پہلوی زبان سے ابنِ مقفی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو ''کلیلہ ودمنہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بارھویں صدی عیسوی میں نصر اللہ منشی نے ابنِ مقفی کے ترجمے کو سادہ فارسی نثر میں منتقل کیا۔ ان دونوں ترجموں کو بنیاد بنا کر 1470 اور 1505 کے درمیان ایران کے عالم اور انشا پرداز ملا حسین واعظ کاشفی نے ''انوارِ سہیلی'' لکھی۔ جو اپنے رنگین اسلوب کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ اودھ کے ایک جلیل القدر مدبر اور دبستانِ ناسخ کے نمائندہ شاعر فقیر محمد خان گویا نے ''بستانِ حکمت'' کے نام سے اردو میں انوارِ سہیلی کا ترجمہ کیا۔ لکھنو میں اردو نثر کے ارتقا میں یہ ترجمہ اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو نثر کی تاریخ میں ملاحسین کاشفی کا ذکر ہمیشہ احترام کے ساتھ کیا جائے گا ، وہ فارسی کے ایک کثیر التصانیف عالم تھے۔ان کی تین کتابیں ایسی ہیں جن کا ترجمہ جب اردو میں کیا گیا تو ان تینوں کوکسی نہ کسی عنوان سے شمالی ہند کی اردو نثر کا قابلِ قدر نمونہ قرار دیا گیا۔ان کی کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ فضل علی فضلی نے ''کربل کتھا'' کے نام سے کیا اور آج کربل کتھا اردو نثر کے اکثر محققین اور مورخین کے نزدیک شمالی ہند کی نثر کا اولین مستند نمونہ ہے۔

ملاحسین واعظ کاشفی کی دوسری کتاب ''اخلاق محسنی'' ابھی کل تک فارسی درسیات میں شامل تھی۔اس کا اردو ترجمہ '' گنج خوبی'' کے نام سے میرامن کیا تھا۔میرامن کے ہمہ جہت کمالات سے شناسائی کے لئے اس کا مطالعہ آج بھی ناگزیر ہے۔

حکائی ادب کے تراجم میں جن مشہور تراجم کا شمار ہوتا ہے ان میں سے چند ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ باغ و بہار

۲۔ انوارِ سہیلی (بستان حکمت)

۳۔ پنچ تنتر (کلیلہ و دمنہ)

۴۔ درسِ عبرت

۵۔ حکایاتِ رومی

۶۔ جوامع الحکایات

۷۔ حکایاتِ اغانی

۸۔ شرح گلستاں وغیرہ

12.3.1 ترجمہ کی اہمیت اور اطلاق

اہمیت و اطلاق:

دنیا بدل رہی ہے اور عالم گیر سطح پر ایک اکائی بنتی جا رہی ہے۔ایسے میں کوئی زبان بھی ترجمے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، کہ جب تک نئے خیال کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ و روپے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔یہی نہیں بلکہ آج کی دنیا میں زبانوں کی مقبولیت پھیلاو اور بڑی حد تک اس کے مفید ہونے پر ہے۔اور افادیت کا پیمانہ یہ ہے کہ کوئی زبان اپنے زمانے کے علمی سرمائے اور ادبی ذخیرے کو کس حد تک اپنے پڑھنے والوں تک پہچانے کی اہل ہے۔اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ اس نے ترجموں کی روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا۔ بین الاقوامی کلچر کے نقوش سے اپنی محفل کو آباد کیا۔

بنیادی طور پر ترجمے کے تین مقاصد ممکن ہیں۔ پہلا معلوماتی ، دوسرا تہذیبی تیسرا جمالیاتی ۔ الفاظ مختلف

قسم کے اقدار کی ترسیل کرتے ہیں پھر ترسیل کی مختلف سطحیں ہیں۔سب سے اوپری اور کسی قدر آسان سطح معلوماتی ہے۔مترجم کا بنیادی مقصد نئی زبان کی وساطت سے معلومات کی ترسیل ہے۔ یہاں ترجمہ جتنا اصل سے قریب ہوگا معلومات کی ترسیل کا حق اتنا ہی بہتر طور پر ادا ہو سکے گا۔اس ضمن میں سائنسی علوم کے ترجمے آئیں گے، یہاں ترجمے کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ کتنے شفاف طور پر اصل کی معلومات ترجمے کے ذریعے دوسری لسانی برادری کے سامنے آئیں۔

دوسری سطح ہے تہذیبی ۔ جہاں ایک تہذیب کے تصورات دوسری تہذیب کے پیکر میں ڈالنے ہوتے ہیں۔اصل میں مترجم کا کام ایک لفظ کی جگہ دوسرے الفاظ رکھنا نہیں ہے،ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں ڈھالنا ہے۔تہذیب اقدار کو جنم دیتی ہے۔اور اقدار سے بنتی اور سنورتی ہے۔اور انہیں کے بل بوتے پر پوری لسانی آبادی کا ردِ عمل متعین ہوتا ہے۔ممکن ہے ایک تہذیب میں ایک مخصوص لفظ تصورات کا آئینہ خانہ ہو لیکن وہی تصور جب دوسری زبان کے لفظ میں ادا ہوتو دوسرے تہذیبی سیاق میں مہمل یا بے معنی ہو جائے۔اس طرح ترجمہ تصورات کی تہذیبی آباد کاری ہے۔اس ضمن میں خاص طور پر ناول اور افسانوں کے ترجمے آتے ہیں۔شاعری کے برخلاف ناول اور افسانہ اشیا اور ماحول کے بیان سے بے تعلق نہیں ہو سکتے۔اور اشیا اور ماحول پر تہذیب کی مہر بہت نمایاں ہوتی ہے۔

تیسری سطح جمالیاتی ہے اور غالبا سب سے زیادہ دشوار۔ جمالیاتی انبساط خود نہایت پیچیدہ عمل ہے۔ یہ عمل الفاظ کے سطحی معنوں کے بجائے ان کے متنوع متعلقات کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔الفاظ صرف معلومات یا محض تصورات پیش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت چھوڑ جاتے ہیں۔سنسکرت کے ماہرین شعریات نے معنی سات نوعتیں قرار دی ہیں۔جن میں معلومات کی ترسیل۔طنز،تضاد،محاورہ،علامتی اظہار، کنایہ، کیفیت سبھی شامل ہیں۔ایک زبان کے ایسے ہمہ جہت لفظ کو دوسری زبان اور دوسری تہذیب کے سیاق وسباق میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے۔اس لئے شاعری کا ترجمہ سب سے زیادہ دشوار ہے۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

آپ نے اس اکائی میں

☆ ترجمہ کی مفہومیاتی، ترسیلی، متنی اور حکائی ترجمے کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی۔

☆ ترجمہ کی روایت کے بارے میں آپ نے واقفیت حاصل کی۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ترجمے کی روایت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھیے؟

☆ ترجمہ کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان کی سماجی زندگی۔ جب ایک سماجی گروہ کا دوسرے گروہ سے سماجی رشتہ

قائم ہونے پر ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لئے ترجمے کا سہارا لینا پڑا ہوگا ،تو ترجمہ کچھ آوازوں اور کچھ اشاروں پر مبنی ہوگا۔حملہ آوروں ،سفیروں اور سیاحوں وغیرہ کی بنیادی ضرورت یہ تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنی بات سمجھا سکیں۔اس سے پہلے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے قابل ہوتے ،کسی ترجمان کے ذریعے انہوں نے ایک دوسرے تک اپنی بات پہچائی ہوگی۔قدیم ہندوستان کے غیر معمولی ترقی یافتہ تہذیب کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں ترجمے کا عام رواج ہوگا۔

یہاں ہم اپنی بات مغل عہد سے شروع کر رہے ہیں۔مغلوں کے عہد میں سرکاری ضرورتوں سے مختلف زبانوں سے فارسی میں اور فارسی سے ان زبانوں میں لازمی طور پر ترجمے ہوتے ہوں گے۔لیکن مغل بادشاہوں نے ہندوستانی ادب کی طرف خاص طور سے توجہ کی ۔عہدِ اکبری میں ایسے ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی ، جو فارسی سے بخوبی واقف تھے۔اکبر کو سنسکرت سے بہت لگاؤ تھا۔اس نے سنسکرت سے شاعری، فلسفہ، ریاضی، الجبرا وغیرہ کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ملا عبدالقادر بدایونی نے 1574 میں ''سنگھاسن بتیسی'' کا ''خردِافروز'' کے نام سے ترجمہ کرایا۔1575 میں بدایونی نے بھاون نامی ایک پنڈت سے ''اتھرو وید'' کا فارسی میں ترجمہ شروع کروایا، لیکن یہ کام پورا نہ ہوسکا۔شیخ فیضی اور حاجی ابراہیم تھانسیری نے یہ کام مکمل کرنے کی کوشش کی ۔لیکن یہ دونوں بھی کامیاب نہیں ہوئے ۔ملا بدایوں نے ''رامائن'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔پھر انہوں نے ''تاریخِ کشمیر'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔اکبر ہی کے عہد میں کئی علما نے مل کر'مہابھارت' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔اسی زمانے میں ''لیلاوتی''،''نل دمن'' اور ''ہری بنس'' وغیرہ کے ترجمے تیار ہوئے ۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ترجموں کی تیاری میں برہمن اور مسلمان عالم دونوں برابر کے شریک تھے۔

ترجمے کا کام صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا۔دوسری ہجری کے وسط میں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔770 ہجری میں سندھ سے ایک وفد 'خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں گیا تھا۔اس وفد میں ایک ایسے پنڈت بھی شامل تھے جو ہیئت اور ریاضیات کے ماہر تھے ۔انہوں نے اپنے ساتھ ہیئت کی مشہور کتاب ''سدھانت'' لے گئے تھے۔خلیفہ کو جب اس کتاب کی مندراجات کا علم ہوا تو اس نے اپنے دربار کے ایک ریاضی داں ابراہیم فراضی کو حکم دیا کہ وہ اس کا عربی میں ترجمہ کرے۔ بغداد کے دو عالم اور ماہر ہیئت ابراہیم فراضی اور یعقوب بن طارق پنڈت کے شاگرد ہوگئے ۔ان دونوں شاگردوں نے اپنے اپنے طریقے سے ''سدھانت'' کی بنیادی اصولوں کو عربی میں منتقل کیا۔ ہیئت کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں ایک ''کلیلہ ودمنہ'' اور دوسری ''بوزاسف و بلوہر'' کلیلہ ودمنہ یہ پنچ تنتر کا ترجمہ ہے، کہا جاتا ہے کہ عربی میں ان دونوں کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کی بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں عربی سے ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

اردوادب کے ابتدائی عہد میں بہت بڑی تعداد میں فارسی ،عربی اور سنسکرت سے اردو نثر میں ترجمے کئے گئے ۔ یہ ترجمے مذہب ،تصوف ،شاعری ،داستان ، ہیئت اور فلسفے کی کتابوں کے تھے۔بعض محققین کا خیال ہے کہ شاہ میرا جی نے ابوالفضائل ،عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیداتِ ہمدانی'' کا عربی سے اردو میں جواردو ترجمہ کیا تھا وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔بعض حضرات کا خیال ہے کہ ملا وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشا پوری کی فارسی تصنیف ''دستورِعشاق'' کا اردو میں ''سب رس'' کے نام سے ترجمہ کیا۔1704 میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف '''' معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا.

خیال ہے کہ ملا وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشا پوری کی فارسی تصنیف ''دستورِعشاق'' کا اردو میں ''سب رس'' کے نام سے ترجمہ کیا۔1704 میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف ''''معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

اٹھارویں صدی کے اوائل میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہوا۔تقریبا اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں کربل کتھا کے نام سے ترجمہ کیا۔ان ترجموں کے بارے میں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ یہ ترجمے نہیں بلکہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمہ ہوتے تھے۔ان میں ترجمہ نگاری کے ان سائنٹیفک اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی جو اچھے ترجموں کے لئے ضروری ہے۔

12.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
ا۔تلخیص	خلاصہ
۲۔ہیئت	شکل،صورت
۳۔عندیہ	ارادہ
۴۔نقلِ ترجمہ	حرفی ترجمہ
۵۔اطلاق	منطبق کرنا،لاگو کرنا، استعمال بروقت

12.8 کتب برائے مطالعہ

۔کتاب	مصنف	اشاعت	
ا۔فن ترجمہ نگاری	پروفیسر ظہورالدین	سیمانت پرکاشن دہلی	2006
۲۔فنِ ترجمہ نگاری	خلیق انجم	ثمر آفسیٹ، دہلی	1995
۳۔فکرو تحقیق	مضمون نگار	سہ ماہی رسالہ، دہلی	2024

اکائی 13۔مترجم Translator ترجمہ کار Translation کا فرق نقلِ ترجمہ Translitretion اور انفرادی نوعیت کے تراجم

ساخت

13.1 تمہید

13.2 اغراض ومقاصد

13.3 مترجم، ترجمہ کار

13.3.1 نقلِ ترجمہ

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

13.5 اپنا امتحان خود لیجئے

13.6 سوالات کے جوابات

13.7 فرہنگ

13.8 کتب برائے مطالعہ

13.1 تمہید

ترجمے کا میدان بہت وسیع ہے۔فلسفے اور مضامین سے لے کر شعر وادب کے نازک ترین اصنافِ سخن تک کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس میں سے ہر ایک کی ہیئت دوسرے سے الگ ہوگی۔بظاہر ترجمے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ایک ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ جن کے اظہار میں احساسات کو التزاماً ذریعہ نہ بنایا گیا ہو بلکہ حتی الوسع احساسات سے آزاد ہوکر خیالات کی ترجمانی کی گئی اور زبان کی تمام صلاحتیں، منطق واستدلال میں اس پر صرف کی گئی ہوں۔فلسفہ اور سائنس وغیرہ اس زمرے میں آتے ہیں۔

دوسری صورت ایسے افکار وخیالات کا ترجمہ ہے جن کا اظہار التزاماً احساسات کے ذریعے کیا گیا ہو اور زبان کی دولت مجرد تصورات کی ترسیل اور منطق و استدلال پر نہیں بلکہ تجربات کی مصوری اور خیالات کو محسوس کرانے کی کوشش میں صرف کی گئی ہو۔شعر وادب کی صنفیں اس زمرے میں آتی ہیں۔

13.2 اغراض ومقاصد

س اکائی میں آپ

☆ مترجم اور ترجمہ کار کا فرق معلوم کر سکیں گے۔

☆ نقلِ ترجمہ کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں گے۔

13.3 مترجم، ترجمہ کار اور نقلِ ترجمہ

مترجم:

کسی نئی تصنیف یا جامع تالیف کا علمی مرتبہ ترجمے پر فائق ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اچھا مترجم ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ اچھا انشا پرداز بھی ہو اور دوسری زبان سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ انشا پردازی کے سلسلے میں خیال آیا کہ بعض اعلی درجے کے مترجم، ترجمے میں اپنا اسلوبِ نگارش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثال مولانا ظفر علی خان کے تراجم ہیں۔ ہیگرڈ کے مترجمہ ناولوں میں بھی ان کی عبارت آرائی کا وہی رنگ جھلکتا ہے جو ''معرکہ مذہب وسائنس'' میں نظر آتا ہے۔ لیکن عام طور پر مترجم کو اصل مصنف کی طرزِ تحریر کا رنگ قبول کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے۔ جبکہ اصل عبارت شاعرانہ یا خاص ادیبانہ رنگ میں لکھی گئی ہو۔ کسی دوسری زبان کے صنائع، تلمیحات، نازک استعارے اپنی زبان میں اسی حسن وخوبی سے ادا کر دینا خود مترجم کی انشا پردازی کا کمال سمجھنا چاہیے، جو حضرات اپنی زبان میں رنگین عبارت آرائی کی مشق اور مہارت نہیں رکھتے، ان کے لئے سلامتی کی راہ یہی ہوتی ہے کہ ان موقعوں پر صاف اور سادہ زبان میں ادائے مطلب پر قناعت کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ اصل کی ایک نقل ہے۔ جیسے مصوری یا اداکاری، مصوری میں تو قلم سے اداکاری میں جسم کی حرکات و سکنات سے اور ترجمے میں زبان دانی کی صلاحیت سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت کی کوئی نقالی مکمل طور پر نہیں ہوسکتی جب تک اس میں نقل کرنے والے کا جذبِ اندرون شامل نہ ہو۔ وہ اداکاری بے روح ہوتی ہے جو اصل کردار کو اپنے اندر جذب کر کے خوب رچا کر پھر سے ایک نئے وجود کو جنم نہیں دیتی، جس میں اصلیت اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ابھر کر نظر کے سامنے آئے اور نقل کا یا نقل کرنے والے کا اپنا وجود نظر سے اوجھل ہو جائے۔

ہارون رشید کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کی تصویر کو بے مثل قرار دیا گیا اور وہ تصویر شاہی دربار کے دروازے پر لٹکا دی گئی کہ اگر کسی کو اس کے بے مثل ہونے میں شبہ ہو تو وہ اپنی دلیل پیش کرے۔ تصویر یہ تھی کہ ایک انسانی ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے، کچھ انگور پکے ہیں کچھ کچے، تصویر کا آویزاں ہونا تھا کہ طوطوں اور چڑیوں نے اس پر ٹھونگے مارنے شروع کر دئے۔ لوگوں نے یہ مصوری کا کمال سمجھا کہ جانور بھی اسے سچ مچ کا انگور سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ایک شخص دربار میں حاضر ہوا اور اس نے مصور کے کمال کو چیلینج کر دیا، اس نے کہا کہ انگور کے خوشے تو واقعی اصلی انگور نظر آتے ہیں، لیکن انسانی ہاتھ کی مصوری میں ضرور کوئی نقص رہ گیا ہے ورنہ چڑیوں کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس پر ٹھونگیں ماریں، یعنی تصویر کے ایک حصے پر مصور کے ایک حصے پر مصور کی توجہ اتنی زیادہ رہی کہ دوسرا حصہ نظر انداز ہو گیا اور نقالی میں فرق آ گیا۔ یہ دلیل مان لی گئی اور تصویر اتار دی گئی۔ نقل وہی بے عیب اور اعلی ہے

جواصل کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو من وعن نظر کے سامنے کر دے اور وہ بھی اس طرح کے کہ جو امکانات اصل میں موجود ہیں یا ظاہر نظر نہیں آتے، وہ بھی نظر آنے لگے۔

ترجمہ نگار کو اصل کی نقل کرنے میں ایک مصور اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اختیار کرنا پڑتا ہے۔اس کے ساتھ تالیاں بجانا، قہقہے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے۔اور یہ سب کر لینے کے باوجود پوری طرح سنجیدہ رہنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ترجمہ ایک آرٹ بنتا پڑتا ہے اور تخلیقی درجہ حاصل کرنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔مگر دوسرے فنونِ لطیفہ میں اور اس ترجمے میں جو آرٹ اور تخلیق کا درجہ رکھتا ہے، ایک بنیادی فرق بھی ہے ۔شاعری اور مصوری میں مبالغہ ایک حسن ہے۔حقیقت کو لفظوں اور تصویروں میں اصل سے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور جس پہلو پر دیکھنے یا سننے والے کی توجہ مرکوز کرنی ہے اسے خوب نمایاں کرنا یا اسے اصلیت سے بالکل مختلف شکل میں اس طرح رکھنا کہ اصل تصویر یا اصل واقعے پر نظر جانے کے بجائے اس کے امکانات ،اس کے اثرات ،جذبات اور احساسات یا مخصوص گوشوں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔جو بات اصل کی محض نقل میں نہیں ہو سکتی تھی وہ آرٹ کی اس تخلیق میں حاصل ہو جاتی ہے کہ اس میں اصل اپنے اندر جذب کر کے ایک نئے وجود، نئی تصویر یا واقعے کو جنم دینا ہوتا ہے۔جو اصل سے تعلق بھی رکھتا ہو اور بے تعلق بھی ہو۔فنی تخلیق کے اس مقصد کی خاطر ہر ایک فن کار کو کافی آزادیاں ملی ہوئیں ہیں۔اسے چاہیے کہ اس کا مفید استعمال کرے۔

دراصل ترجمے کا بنیادی منشا ہی اصل کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہے۔اور اسی منشا کو پورا کرنے کے لئے زبان کا پورا پورا علم اور مکمل اندازہ ضروری ہوتا ہے۔اس کی تین صورتیں مترجم کے لئے ضروریہیں۔

☆ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے اصطلاحات اور محاوروں سے اور کسی قدر ادبیات سے تھوڑی بہت واقفیت شرطِ اول ہے۔یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو اور وہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اس طرح بے تکلف لکھ سکتا ہو یا بول سکتا ہے۔بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے ورنہ خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔اصل عبارت کی نوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا۔اور وہ اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی طرف سے غافل رہے گا۔اگر اصل تصنیف یا اصل عبارت کی زبان کا علم صرف کتابی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہو تو اور اچھا ہے۔لیکن کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ وہ اصل عبارت کے سیاق وسباق کو سمجھ سکے یا پا سکے کہ فلاں قسم کا لفظ نظر انداز کر کے فلاں لفظ مصنف نے خاص اس مقصد سے رکھا ہے، یہ مقصد اگر سمجھ میں آ جاتا ہے تو ترجمہ کرتے وقت اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، اس مقصد کو کسی ہم پلہ لفظ سے پورا کیا جا سکے گا ورنہ نہیں۔اس مسئلے میں لغت سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن جو چیز لغت سے زیادہ کار آمد ہے وہ ہے اس زبان کے ادب کا مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے۔مثلا سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے مصنف نے ایک ترجمہ کیا، جس کا موضوع ''سیاسیات'' تھا

۔اصل کتاب روسی زبان میں لکھی گئی تھی پھر ترجمہ ہوکرانگریزی میں آئی اب انگریزی سے اسے اردو میں ترجمہ کرنا ہے۔ایسے میں انگریزی کا ایک لفظ ہے۔''

یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے Equilibrium پر قائم ہے۔''

اب اگر لغت کھول کر دیکھا جائے تو ''اکویلیبریم'' کے معنی (توازن یا غیر جانب دارانہ حالت) کے ہیں۔ذی علم ترجمہ کرنے والے نے اگر یہی لفظ اٹھا کر وہاں رکھ دئے ہیں تو ترجمہ مناسب نہیں ہوگا کیونکہ معنی اگر توازن ہی کے لینے ہوتے تو انگریزی میں ترجمہ کرنے والے مترجم نے Balance یا State of Neutrality لکھا ہوتا۔اصل مصنف نے ان الفاظ کو رد کر کے خصوصیت کے ساتھ 'اکوی لی بریم'' لکھا ہے تو اس کے پورے مفہوم میں کچھ اور بھی شامل ہے۔کیا شامل ہے؟

یہ بات پوری عبارت سے اور اس لفظ کے سارے امکانات کو جاننے سے ہی معلوم ہوتی ہے۔اس میں غیر جانب داری اور توازن کے ساتھ آپس کے برادرانہ تعلقات اور ہم آہنگی کا مفہوم بھی رکھا گیا ہے۔چنانچہ ایسے موقعہ پر ''اکوی بیرم کا ترجمہ ''جذبِ باہم اور ہم آہنگی'' کیا جائے۔تو مصنف کے مفہوم کو پوری طرح ادا کر سکے گا۔

☆ دوسری شرط یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے،اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔اصل تصنیف کی زبان سے زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہیے جس میں ترجمہ کا نامقصود ہے یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی پختہ مشق ہونی چاہیے۔اور اس زبان کا پورا پورا علم ہونا چاہیے۔زبان کے پورے علم سے مراد یہ کہ اس کے ماخذ کا جہاں جہاں سے وہ چلی ہے،ان سرچشموں کا ان کے نشیب وفراز کا علم ہو۔الفاظ کہاں سے آئے؟ کیونکر آئے اور ان کے لغوی معنی کیا تھے؟اصطلاحی معنی کیا ہو گئے؟اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ان کی ترکیبیں اور محاورے کیونکر بنے؟ انہیں مختلف موقعوں پر کیسے کیسے استعمال کیا گیا اور آئندہ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں۔ایک ہی لفظ کتنے مفہوم اپنے دامن میں رکھتا ہے؟اور ایک ہی مفہوم کو جب مختلف چیزوں کی نسبت سے ادا کیا جائے تو کس کے لئے کتنے الفاظ علیحدی علیحدہ موجود ہیں۔

یہ باتیں جاننے کے لئے عمرِ نوح کی ضرورت نہیں ہے۔اور نہ یہ کہ پہلے ایک زبان کو آخری تہ تک کھنگال ڈالنے اور غوطے لگانے سے فراغت حاصل کر لی جائے۔اور اس کے بعد ترجمے کے لئے قلم اٹھایا جائے۔

کسی زبان کا اس درجہ علم ہونا دراصل ایک ارتقائی عمل ہے۔یہ دھیرے دھیرے ہوتا رہتا ہے اور اگر توجہ رکھی جائے تو ترجمہ کے دوران ہی ہوتا رہتا ہے۔مترجم کا کام دورِ حاضر میں انتہائی معنی رکھتا ہے کیونکہ زبانیں باہم ملنے لگیں ہیں،ٹیکنالوجی کے ذریعے سے مشینی تراجم ہو رہے ہیں لیکن ان میں وہ شفافیت اور اصلیت،نہیں جو خود

مترجم نے کی ہو۔

ترجمہ کار Translation

ترجمے کے ذریعے زبان کئی طرح پھلتی اور پھولتی ہے۔اس کی کئی طرح کی خوبیاں مضامی کے حوالے سے پیدا ہوتی ہیں۔وہ ایک وقت میں علم الشعر کو بیان کرسکتی ہے۔اور دوسرے وقت میں وہی زبان فلسفے کی زبان بھی بن سکتی ہے۔اسی زبان میں طب کی باتیں کی جاسکتی ہیں۔اور وہی ٹریفک کے اصولوں کی ،بچوں کی نظموں اور قانون کی زبان بھی بن سکتی ہے۔لوگ اس کے ذریعے ریاضی کے مسائل حل کرتے ہیں۔اور سائنس کے طالبِ علم ٹھوس، مائع اور گیس کی باتیں کرتے ہیں۔نفسیات،عمرانیات،اکنامکس،تاریخ اور دقیق علمی مسائل بھی زبان ہی کے ذریعے بیان کئے جاتے ہیں۔لیکن شرط زبان کے تجربے اور تربیت کی ہے۔ترجمے کی نوعیت کی ہے، کہ آیا، حقائق وتصورات صحیح پیمانے پر پیش ہوئے ہیں یانہیں!

ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد دیتا ہے وہیں ترجمے کی تمدنی اور ثقافتی ضرورت بھی پورا کرتا ہے۔ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔خیالات اور جذبات کو بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں۔نئی اصطلاحیں وضع کرنی پڑتی ہیں۔نئے محاورے اور نئی محرکات دستیاب ہوتی ہیں۔فکر وتحقیق کے لئے نئے اسالیب اور نئے سانچے ڈھلتے جاتے ہیں۔

اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے اس لئے کہ ترجمے سے متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش کرنا نہیں بلکہ افراد کی راہ نمائی مقصود ہوتی ہے۔جو دوسری زبان کو نہیں جانتے۔صاف ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے لئے غیر زبان کی تفہیم ان کو انہی کی اپنی زبان واسلوب بیان میں بتلانا پڑتا ہے۔یہ ایک اعتبار سے بازیافت کا عمل ہے۔اصل کو پڑھ کر اس سے ترجمے کی زبان میں اس کے روزمرہ محاورہ کے مطابق بیان کرنا کسی تخلیق سے کم نہیں ہوتا۔

جس تحریر کا ترجمہ کیا جارہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے کچھ اصول ومبادیات بھی ہوں۔ترجمہ دوزبانوں کے متن میں باہمی ربط قائم کرنے نیز ان متون کی افہام وتفہیم کا بہترین ذریعہ ہے۔جو تہذیبی اور لسانیاتی سطح پر رشتوں کو استوار کرتا ہے۔ترجمہ ایک فن اور آرٹ ہے جو ترجمہ نگار کو ادیب بھی بنادیتا ہے۔وینکٹیشور شاستری نے اپنے مقالے Translation : A Craft Savory میں چند اقوال پیش کئے ہیں۔

☆ ترجمہ کرنے میں ترجمہ ہی لگنا چاہیے۔

☆ ترجمہ کی بنیادی تحریر کا خیال پیش کرنا چاہیے۔

☆ ترجمہ اصل تحریر کا ہم عصر نظر آنا چاہیے۔

☆ ترجمے کو اصل تحریر کے اسلوب کا عکاس ہونا چاہیے۔

☆ ترجمے کا اسلوب ترجمہ کی طرح ہونا چاہیے۔

مترجم اصل متن میں ترمیم واضافہ کرسکتا ہے اورنہیں بھی کرسکتا۔

سیوری کے مذکورہ بالا تجربات اور بیانات سے کسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے کیونکہ مختلف اقسام اور موضوعات میں اس ذیل میں لفظی ترجمہ اورآزاد ترجمہ دو الگ الگ متون پر منحصر ہوتا ہے۔ ترجمہ نگار کو متن کے مقاصد، آہنگ ،مفاہیم اور جہت کو واضح کرنا ضروری ہے۔

ترجمے کی عموماً دوقسمیں کی گئی ہیں۔

۱۔ موضوعاتی

۲۔ ہیئتی یا فنی

موضوعاتی زمرے میں ترجمے کی جو اقسام شمار کی جاسکتی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ علمی ترجمہ

۲۔ ادبی ترجمہ

۳۔ صحافتی ترجمہ

اس طرح ہیئتی زمرے میں حسبِ ذیل اقسام کو رکھ سکتے ہیں۔

۱۔ لفظی ترجمہ

۲۔ آزاد ترجمہ

۳۔ تخلیقی ترجمہ

ترجموں کی یہ تقسیم بندی حتمی ہرگز نہیں ہے۔ زندگی کی طرح یہاں بھی نئے امکانات کی تلاش باقی رہتی ہے۔ اس لئے مندرجہ بالا تقسیم کو محض ایک پڑاؤ تصور کرنا چاہیے، منزل نہیں۔

13.3.1 نقل ترجمہ Translitraetion

نقل ترجمہ کو نقلِ حرفی بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں کسی بھی تحریر کو من وعن رکھا جاتا ہے۔ اس میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں معنی ترجمہ کئے بغیر لکھ دیا جاتا ہے جیسے

''غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے''

Ghalib ny murasly kw mukalima bna diya hai.

.2 کیا مشکل درپیش ہے؟

kya mushkil drpesh hai ?

اس طریقہ استعمال سے کسی بھی زبان کے الفاظ کو ہم اپنی زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔ مگر سمجھنے کے لئے ترجمہ ہی

درکار رہوتا ہے۔

نقلِ حرفی ایک اسکرپٹ سے دوسرے اسکرپٹ میں متن کی تبدیلی ہے جس میں خطوط کی متوقع طریقوں سے تبدیل کرنا شامل ہے۔

ایک اور مثال

نازکی ان کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے   میر تقی میر

Nazuki un k lab ki kya khiye
Pankhdi ek gulab ki si hai

ترجمہ اور نقل ترجمہ میں فرق:

ترجمہ ایک زبان سے دوسرے زبان میں متن کی منتقلی ہے۔ جیسے

یہ گلاب ہے۔

It is a Rose.

Epitaph
stop,stranger stop
As You pass by
So youn are now
Once was i
So i am now,You
Once must to be
Therefore?Proper to follow one

لوحِ مزار
ذرا اجنبی چلتے چلتے تو رک جا
تو جیسا ہے اب ایک میں وہی تھا
ہوں جیسا میں اب، کل ترا حال ہوگا
تو نقشِ قدم پر مرے چل خدارا ذرا

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی میں آپ نے

☆ ترجمہ اور ترجمہ کار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

☆نقلِ ترجمہ کے بارے میں آپ کو آگاہی حاصل ہوئی۔

13.5 اپنا امتحان خود لیجئے

ا۔ترجمہ نگاری کی اہمیت وافادیت واضح کیجئے؟

۲۔نقلِ ترجمہ پر نوٹ لکھیے؟

13.6 سوالات کے جوابات

ا۔کسی نئی تصنیف یا جامع تالیف کا علمی مرتبہ ترجمے پر فائق ہے لیکن یہ یادرکھنا چاہیے کہ اچھا مترجم ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ اچھا انشا پرداز بھی ہواور دوسری زبان سے عمدہ واقفیت رکھتا ہو۔انشا پردازی کے سلسلے میں خیال آیا کہ بعض اعلی درجے کے مترجم ،ترجمے میں اپنا اسلوبِ نگارش پیدا کردیتے ہیں۔اس کی بہت اچھی مثال مولانا ظفرعلی خان کے تراجم ہیں۔ہیگرڈ کے مترجمہ ناولوں میں بھی ان کی عبارت آرائی کا وہی رنگ جھلکتا ہے جو ''معرکہ مذہب وسائنس'' میں نظر آتا ہے۔لیکن عام طور پر مترجم کو اصل مصنف کی طرزِ تحریر کا رنگ قبول کرنا پڑتا ہے۔زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے ۔جبکہ اصل عبارت شاعرانہ یا خاص ادیبانہ رنگ میں لکھی گئی ہو۔کسی دوسری زبان کے صنائع تلمیحات ،نازک استعارے اپنی زبان میں اسی حسن وخوبی سے ادا کردینا خود مترجم کی انشا پردازی کا کمال سمجھنا چاہیے،جوحضرات اپنی زبان میں رنگین عبارت آرائی کی مشق اورمہارت نہیں رکھتے،ان کے لئے سلامتی کی راہ یہی ہوتی ہے کہ ان موقعوں پر صاف اور سادہ زبان میں ادائے مطلب پر قناعت کریں۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ اصل کی ایک نقل ہے۔جیسے مصوری یا اداکاری ،مصوری میں تو قلم سے اداکاری میں جسم کی حرکات وسکنات سے اور ترجمے میں زبان دانی کی صلاحیت سے کام لینا پڑتا ہے۔لیکن حقیقت کی کوئی نقالی مکمل طور پر نہیں ہوسکتی جب تک اس میں نقل کرنے والے کا جذبِ اندرون شامل نہ ہو۔وہ اداکاری بے روح ہوتی ہے جو اصل کردار کو اپنے اندر جذب کر کے خوب رچا کر پھر سے ایک نئے وجود کو جنم نہیں دیتی ،جس میں اصلیت اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ابھر کر نظر کے سامنے آئے اور نقل کا یا نقل کرنے والے کا اپنا وجود نظر سے اوجھل ہوجائے۔

ہارون رشید کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کی تصویر کو بے مثل قرار دیا گیا اور وہ تصویر شاہی دربار کے دروازے پر لٹکا دی گئی کہ اگر کسی کو اس کے بے مثل ہونے میں شبہ ہو تو وہ اپنی دلیل پیش کرے۔تصویر یہ تھی کہ ایک انسانی ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے، کچھ انگور پکے ہیں کچھ کچے،تصویر کا آویزاں ہونا تھا کہ طوطوں اور چڑیوں نے اس پر ٹھونگے مارنے شروع کردئے۔

لوگوں نے یہ مصوری کا کمال سمجھا کہ جانور بھی اسے سچ مچ کا انگور سمجھ رہے ہیں۔لیکن ایک شخص دربار میں حاضر ہوا اور اس نے مصور کے کمال کو چیلینج کردیا،اس نے کہا کہ انگور کے خوشے تو واقعی اصلی انگور نظر آتے ہیں

،لیکن انسانی ہاتھ کی مصوری میں ضرور کوئی نقص رہ گیا ہے ورنہ چڑیوں کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس پر ٹھونگیں ماریں ،یعنی تصویر کے ایک حصے پر مصور کے ایک حصے پر مصور کی توجہ اتنی زیادہ رہی کہ دوسرا حصہ نظر انداز ہو گیا اور نقالی میں فرق آ گیا۔ یہ دلیل مان لی گئی اور تصویر اتار دی گئی۔

نقل وہی بے عیب اور اعلی ہے جو اصل کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو من وعن نظر کے سامنے کر دے اور وہ بھی اس طرح کے کہ جو امکانات اصل میں موجود ہیں یا ظاہر نظر نہیں آتے، وہ بھی نظر آنے لگے۔

۲۔نقل ترجمہ کو نقلِ حرفی بھی کہا جاتا ہے۔اس میں کسی بھی تحریر کو من وعن رکھا جاتا ہے۔اس میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں معنی ترجمہ کئے بغیر لکھ دیا جاتا ہے جیسے

'غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے'

Ghalib ny murasly kw mukalima bna diya hai.

.2 کیا مشکل درپیش ہے؟

kya mushkil drpesh hai ?

اس طریقہ استعمال سے کسی بھی زبان کے الفاظ کو ہم اپنی زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔مگر سمجھنے کے لئے ترجمہ ہی درکار ہوتا ہے۔

نقلِ حرفی ایک اسکرپٹ سے دوسرے اسکرپٹ میں متن کی تبدیلی ہے جس میں خطوط کی متوقع طریقوں سے تبدیل کرنا شامل ہے۔

ایک اور مثال

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے — میر تقی میر

Nazuki us ke lab ki kya khiye
Pankhdi ek gulab ki si hai

ترجمہ اور نقل ترجمہ میں فرق:

ترجمہ ایک زبان سے دوسرے زبان میں متن کی منتقلی ہے۔جیسے

یہ گلاب ہے۔
It is a Rose.

Epitaph
stop,stranger stop

As You pass by
So youn are now
Once was i
now,You
Once must to be
Therefore?Proper to followone

لوحِ مزار

ذرا اجنبی چلتے چلتے تو رک جا
تو جیسا ہے اب ایک میں وہی تھا
ہوں جیسا میں اب، کل ترا حال ہوگا
تو نقشِ قدم پر مرے چل خدارا ذرا

13.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
۱۔اسلوب	طریقہ تحریر،تحریر کا انداز
۲۔مفہومیاتی	معنوی
۳۔متون	متن کی جمع،تحریر
۴۔ترسیل	منتقل کرنا، پہنچانا
۵۔محرکات	حرکت دینے والا

13.8 مطالعہ برائے کتب

۔کتاب	مصنف	اشاعت	
۱۔فنِ ترجمہ نگاری	پروفیسر ظہورالدین	سیمانت پرکاشن دہلی	2006
۲۔فنِ ترجمہ نگاری	خلیق انجم	ثمر آفسیٹ، دہلی	1995
۳۔فکر و تحقیق	مضمون نگار	سہ ماہی رسالہ، دہلی	2024

اکائی-14۔ اردو ترجمے کے اقسام،لسانی مسائل اور امتیازات

ساخت

14.1 اغراض ومقاصد

14.2 تمہید

14.3 ترجمے کے اقسام

14.4 لسانی مسائل

14.5 ترجمے کے امتیازات

14.6 خلاصہ

14.7 آپ نے کیا سیکھا؟

14.8 اپنا امتحان خود لیجئے

14.9 فرہنگ

14.10 سوالات کے جوابات

14.11 کتب برائے مطالعہ

14.1۔اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ

1- ترجمے کی اقسام کون کون سی ہیں۔

2- اقسام کے لحاظ سے ان کی اہمیت کیا ہے۔

3- ترجمے کے لسانی مسائل کیا ہیں۔

4- ترجمے کے ثقافتی محرکات کیا ہیں۔

5- ترجمے کے امتیازات کیا ہیں۔

14.2 ۔ تمہید

اس ترقی یافتہ دور میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اپنے اپنے ملک اور معاشرتے تک محدود رہیں۔ایسے میں ترقی کے لئے جہاں دیگر بہت ساری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہیں ہر معاشرے کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے قابل

مترجمین کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ قابل مترجمین سے مراد ایسے مترجمین سے ہے جو ہر دو زبانوں کو اچھی طرح سمجھتے ہوں جو ایک زبان میں کہی گئی بات کے مفہوم کو دوسری زبان میں من وعن کہنے کا ہنر جانتے ہوں۔ مفہوم کی سطح تک ہر زبان کے الفاظ میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ ضرورت کے مطابق ان میں توسیع کی جا سکے اور اپنے مفاہیم کی ادائیگی کے لئے اصطلاحیں بنائی جاسکیں۔ نئے افکار اور مفاہیم کی ادائیگی کے لئے نئے نئے الفاظ بنائے بھی جاتے ہیں اور پرانے الفاظ میں تبدیلی بھی کی جاتی ہے۔ مذکر و مؤنث کا معاملہ بھی اسی وقت آڑے آتا ہے جب ہم لفظی ترجمہ کرتے ہیں جیسے ہی ہم دونوں زبانوں پر گرفت حاصل کرتے ہیں یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اکثر و بیشتر زبان کی خوبصورتی پر آنچ آتی ہے اور اصل متن کی خوبصورتی ضائع ہو جاتی ہے۔ دراصل زبان کی خوبصورتی سے ان لوگوں کی مراد زبان میں موجود صنائع بدائع، تراکیب، تشبیہ اور استعارات سے ہوتی ہے جو زبان کو خوبصورت بناتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ترجمے کا اولین مقصد ایک نامعلوم زبان کی چیزیں، افکار و خیالات اور تجربات کو معلوم زبان میں داخل کر دینا ہے۔ اس کے لئے مترجم کا دونوں زبانوں پر عبور کافی ہے۔ اب رہا سوال صنائع بدائع اور فصاحت و بلاغت کا تو اس کے لئے مترجم کا دونوں زبانوں کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ اگر اس کی نظر دونوں زبانوں پر گہری نہیں ہے اور وہ دونوں زبانوں کی نزاکت سے واقف نہیں ہے، قوائد و ضوابط کا جانکار نہیں ہے تو غلطی مترجم کی ہے، ترجمے کی افادیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اردو زبان کی ترقی میں تراجم کا جو اہم رول رہا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر چہ اردو تراجم انگریزی اور عربی میں ہوئے تراجم کے مقابلے میں کم ہیں لیکن اردو کی عمر کو دیکھتے ہوئے ایسے کم بھی نہیں ہیں۔ اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی یا انگریزی بولنے والی قوموں نے جب یہاں کی فکر، کلچر اور خیالات سے اپنے کو ہم آہنگ کرنا چاہا تو ترجمے سے ہی مدد لی۔

ویسے تو مترجم کو اصل متن کے اسلوب کو بدلنا نہیں چاہئے یا اس میں کوئی تحریف نہیں کرنا چاہئے لیکن ادبی فن پاروں کو ترجمہ کرتے وقت اگر مترجم یہ محسوس کرے کہ بنیادی متن کا پلاٹ ڈھیلا ہے، تکرار ہے یا پلاٹ بے ڈول ہے تو یہاں وہ ایک اچھے مترجم کی طرح منشائے مصنف کو نظر میں رکھتے ہوئے بنیادی متن کی ان خامیوں کو اپنے تراجم میں دور کر سکتا ہے۔

14.3۔ ترجمے کے اقسام

ابھی تک ترجمے سے متعلق جو کام ہوتے ہیں انھیں مجموعی اعتبار سے دو زمروں میں رکھا جا سکتا ہے۔

<u>پہلا زمرہ: موضوعاتی</u>

اس زمرے میں ترجمے کے جو اقسام آتے ہیں وہ اس طرح ہیں:

I- علمی ترجمہ، II- ادبی ترجمہ، III- صحافتی ترجمہ۔

<u>دوسرا زمرہ: ہیئتی یا فنی</u>

اس زمرے میں: I- لفظی ترجمہ، II- آزاد ترجمہ، III- تخلیقی ترجمے (نظم ونثر) آتے ہیں۔

ترجموں کی یہ گروہ بندی حرف آخر نہیں ہے کسی اور تحریر کے سامنے آنے پر صورت حال بدل بھی سکتی ہے یا زمروں کی ترتیب میں تبدیلی آسکتی ہے۔اس لئے تقسیم بالا کو محض ایک پڑاؤ تصور کرنا چاہئے منزل نہیں۔

علمی ترجمہ:

ترجمے کی اس قسم میں تمام سائنسی اور علمی علوم وفنون شامل ہیں۔ اس قسم کے تراجم کا بنیادی مقصد معلومات کی ترسیل ہوتا ہے۔ چنانچہ ترجمے کی زبان صاف وشستہ ہونی چاہئے۔ تاکہ قاری اسے آسانی سے سمجھ لے۔اس قسم کے تراجم میں کامیابی کے لئے مترجم کا اس علم کا ماہر ہونا چاہئے جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ دوسرے ترجمہ کرتے وقت ان قارئین کو ذہن میں رکھنا چاہئے جن کے لئے ترجمہ کیا جارہا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ مترجم کو اس زبان پر بھی قدرت ہونی چاہئے جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔ نیز اس زبان کے لسانی، علمی، ادبی اور تمدنی انسلاکات سے بھی واقف ہونا چاہئے جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے۔

علمی ترجمہ کرتے وقت سب سے زیادہ دقت علمی اصطلاحات کے مترادفات حاصل کرنے میں پیش آتی ہے۔اس سلسلے میں مرزا احامد بیگ لکھتے ہیں:

''علمی تراجم میں اہم مسئلہ علمی اصطلاحات کے مترادفات ڈھونڈھنے کا ہوتا ہے۔علمی اصطلاحات وضع کرتے وقت اس امر کا بالخصوص خیال رکھا جانا چاہئے کہ اصطلاحیں مسلم اصولوں کے عین مطابق ہوں۔ نیز لاطینی، یونانی اور دوسرے لاحقوں اور سابقوں کے ترجمے/مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے.... جہاں تک علمی اور فنی تراجم کا تعلق ہے۔'' (مرزا احامد بیگ، فن ترجمہ کے اصول اور مبادیات، مطبوعہ اوراق، لاہور، ص، 110)

مندرجہ بالا اقتباس میں ''مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے'' سے مراد یہ ہے کہ ایک بار کسی اصطلاح کے لئے جو متبادل اصطلاح استعمال ہو، بعد میں اسے بدلنے کی کوشش نہ کی جائے، اس سے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ادبی ترجمہ:

ترجمے کی اس قسم کا بنیادی مقصد ترجمے کے لسانی پہلو کو اس حد تک شستہ بنانا ہے کہ وہ اصل سے قریب ہو جائے۔ یہ کام مترجم اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک وہ ترجمے کی زبان کو بامحاورہ بنانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو اور جو قاری کو استعارات، تشبیہات، ضرب الامثال اور علامات سے جمالیاتی تلذذ (Aesthetic Pleasure) پہنچائے۔اس سلسلے میں مرزا احامد بیگ لکھتے ہیں:

''یوں ادبی تراجم میں مترجم اپنے خیال، اپنے وجود، اپنے جذبے، اپنی پیشگی اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے تابع کر دیتا ہے۔صرف اس خیال سے کہ اگر فلاں بات اور فلاں عبارت مصنف کو ہماری زبان میں لکھنا ہوتی تو وہ کس طرح لکھتا۔جس طرح اصل مصنف اس دوسری زبان میں اسے لکھتا بعینہٖ ویسا لکھنے کا جتن کرنا چاہئے۔''

ادبی ترجمے میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ بنیادی متن کا مرکزی خیال کسی بھی طرح مجروح نہ ہو اور سورس لینگوئج کا مصنف جو کہنا چاہتا ہے وہ بات معدوم نہ ہو جائے۔

صحافتی ترجمہ

ترجمے کی یہ قسم نسبتاً آسان ہوتی ہے کیونکہ اس میں لفظ بہ لفظ یا جملہ بہ جملہ ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔کسی اقتباس کو پڑھ کر مترجم مجموعی مفہوم کو اپنی زبان میں پیش کر دیتا ہے۔اس میں لفظوں کے متبادل تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ کسی اقتباس کی طوالت یا پیچیدگی کی وجہ سے ترجمے کو بھی اتنا ہی کھینچنا پڑتا ہے۔اس کا مجموعی مفہوم مترجم اپنی زبان میں چھوٹے چھوٹے جملے میں پیش کر دیتا ہے۔تاکہ اسے قارئین کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ترجمے کی اس قسم کو ''کھلا ترجمہ'' کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔مولانا عبدالمجید سالک ترجمے کی اس قسم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے، مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں گے اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ان کو چاہئے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترتیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں۔اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک بار پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل مطلب ادا ہو گیا ہے۔اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہو گیا ہو تو سبحان اللہ، ورنہ ادھر ادھر کی پیش کر کے اسے پورا کر دیں۔ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہئے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ ہم بڑے انگریزی داں اور بڑے اردو خواں ہیں۔کیوں کہ ممکن ہے کہ وقت پر کسی کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔

چونکہ اخباری ترجمہ زیادہ بناؤ سنگھار اور خوش بیانی کے بجائے نفس مضمون ادا کرنے سے متعلق ہے۔اس لئے اس کا ادبیت سے دور ہونا بھی ایک طرح کی خوبی بن جاتا ہے۔صحافتی تراجم روزمرہ زندگی سے قریب ہونے کے سبب زبان کو نت نئے الفاظ اور پیشہ ورانہ اصطلاحات بخشتے اور اس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔یوں بعض اوقات صحافتی ترجمہ بھی تخلیقی ادب پر اثر انداز ہوتا ہے۔''

(عبدالمجید سالک، فن ترجمہ کے اصول اور مبادیات، اوراق، لاہور، ص،120)

<u>دوسرا زمرہ: ہیئتی یا فنی</u>

لفظی ترجمہ:

فن ترجمہ میں لفظی ترجمہ نگاری کی تاریخی اہمیت بھی ہے، اس میں عموماً مذہبی اور مقتدر کتابوں، دستاویزات، اقوال، مراسلات اور بادشاہوں کے فرمانوں کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ آج بھی عام طور سے مذہبی کتابوں اور عدالتی دستاویزات اور دیگر اہم کاغذات کا لفظی ترجمہ کیا جاتا ہے۔

لفظی ترجمے کی اہمیت اور ماہیت سے متعلق جمیل جالبی فرماتے ہیں:

''ترجمے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس۔ اسے ترجمہ کہنا نہیں بلکہ مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں۔''

لفظی ترجمے کے سلسلے میں جو دقتیں آتی ہیں، ان کی طرف اکبرآبادی کا یہ اقتباس اشارہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے سلسلہ خیالات کو ذرا بھی برہم نہیں ہونے دیا۔ فقروں کی ترکیب کی پیچیدگی دور کی ہے۔ معنی کو کامل اور روشن کرنے کے لئے ایک لفظ کے ترجمے میں حسب ضرورت دو دو اور تین تین رکھ دیئے ہیں لیکن خیالات کا سہل کرنا میرا کام نہ تھا۔'' (اکبرالہ آبادی، مقدمہ کتاب، مسلمانوں کی حالت آئندہ ترجمہ، مطبوعہ میرٹھ، 1884ء، مشمولہ ترجمے کا فن، مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء، ص، 66)

ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں بھی ویسا ہی مل جائے یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر ملتا جلتا لفظ مل بھی جاتا ہے تو اس کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ انھیں سیاق کے حساب سے استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لفظی ترجمہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے جمیل جالبی لفظی ترجمے کے برعکس معنویت کے ابلاغ پر زور دیتے ہیں۔ اصل مصنف کا لہجہ تک محفوظ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔

آزاد ترجمہ:

کسی متن کو پڑھ کر اس کے مفہوم کو اپنی زبان میں بیان کر دینا آزاد ترجمہ کہلاتا ہے۔ یعنی اس میں لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ کا ترجمہ نہیں کیا جاتا ہے۔ ایسے ترجمے کے حق میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے۔ اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ کا اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ ایک نیا سانچہ آ جاتا ہے۔ دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے۔'' (جمیل جالبی، ترجمے کے مسائل، مشمولہ مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فنی نظری مباحث، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء، ص، 119)

جمیل جالبی لفظی ترجمے کے برعکس معنویت کے ابلاغ پر زور دیتے ہیں۔ اصل مصنف کا لہجہ تک محفوظ رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس طرح کے تراجم کو وہ زبان وادب میں زرخیزی دینے والے گردانتے ہیں۔ اس طرح سائسرو (Cicero) بھی آزاد ترجمے کو ہی پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں لکھتا ہے:

''میں کسی ترجمانی کی طرح ترجمہ نہیں کرتا بلکہ خطیب کی طرح، تا کہ خیالات اور انداز اصلی انداز میں پیش کئے جا سکیں۔ یا جیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ زبان کے نقوش، مگر اس زبان میں جو ہماری زبان سے علاقہ رکھتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنا ضروری نہیں سمجھا، بلکہ اصلی زبان کے عمومی اسلوب کی زبان کی قوت کو محفوظ کیا۔''

(Morcus Trillius Cicero, Quoted Jeremy Munday, Introducing Translation Studies, 3rd edition, p. 30, Routlege, London, Uk. 2012)

تخلیقی ترجمہ:

اب بات کریں تخلیقی ترجمے کی تو تخلیقی ترجمہ ادبی ترجمے کے تحت ہی آتا ہے۔

تخلیقی ترجمہ عموماً ایسی تخلیقات کا ہوتا ہے جو تہہ در تہہ معنویت کی حامل ہوں اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن قسم ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ادب میں متعدد تخلیقی فن کاروں نے اسے پورے طور پر خارج از امکان قرار دیا ہے۔ رو برٹ فراسٹ کا جملہ مشہور ہے کہ شاعری اس چیز کا نام ہے جو ترجمے سے باہر رہ جائے، یہ تو درست ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بہ لفظ مماثلت نہیں ملتی جو با معنی بھی ہو اور درست بھی۔ تاہم تخلیقی ترجمہ کرنے والوں نے شاعری کے اچھے ترجمے کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ مثال میں شیلی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ تخلیقی ترجمے کا صحیح ہونا بہر حال ضروری ہے۔ کیونکہ جو تصور اصل میں ہے وہ اگر نقل میں ادا نہیں ہوتا یا اصل کی سی شدت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو ایسا ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔

14.4۔ ترجمے کے لسانی مسائل

ترجمہ نگاری کو ابتدا میں دوسرے درجے کا کام تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ ترجمے کی اہمیت وافادیت سے بے خبری تھی۔ اسی وجہ سے ماضی میں ترجمے کو وہ مقام ومرتبہ نہ مل سکا جو اس کا حق تھا۔ فن ترجمہ کو اس کے صحیح تناظر میں جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس فن کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے اصولوں سے بھی واقفیت حاصل کی جائے۔

اردو میں ترجمے کی تھیوری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ جو تھوڑی بہت تحریریں سامنے آئی ہیں وہ تاثراتی نوعیت کی ہیں۔ گو ان میں سے چند تحریریں فکر انگیز بھی ہیں۔ لیکن ابھی تک اردو میں اس موضوع پر اس طور پر پیش رفت نہیں ہوئی ہے جو ہونی چاہئے تھی۔ اردو کی تاریخ میں ترجمے کا بیش بہا خزانہ موجود ہے اور یوں اردو کی نشوونما بھی تراجم کے

حوالے سے ہوئی اور لسانیاتی عمل ایک ایسا عمل ہے جس نے ترجمے کے ذریعے اردو زبان وادب کو مضبوط بنیاد فراہم کیں۔خاص طور سے عربی، فارسی اور ہندی نے اردو کے ساتھ جو ترجمے کا رابطہ رکھا۔اس سے یہ فائدہ ہوا کہ عربی قواعد، فارسی زبان کی شیرینی اور ہندی زبان کی فطری معصومیت اردو زبان کا حصہ بنی۔

ترجمہ اس بات سے سروکار رکھتا ہے کہ مصنف نے جو بات متن میں بیان کی ہے وہی قاری تک پہنچائی جائے۔کیوں کہ معروضی حقیقت اصل کتاب یا مسودے کی ہوتی ہے اسے ویسے ہی ترجمہ کی ہوئی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے جو کہ اس کی اصل معنویت کا حامل ہوتا ہے لیکن صرف زبان ہی معنویت کا سبب نہیں ہوتی۔ بلکہ ترجمے کا مزاج اصل مسودے کا مزاج ہونا چاہیئے۔اگر کوئی الیکٹرانک کی کسی کتاب کا ترجمہ کرے گا تو اسے ویسی ہی زبان استعمال کرنی ہوگی جو عموماً الیکٹرانک کے موضوع کے لئے ہوگی۔اگر اس موضوع پر ترجمہ کرنے والا شاعرانہ زبان والفاظ کا استعمال کرے گا تو یہ ترجمہ کتاب کے اصل مزاج سے مختلف ہی نہ ہوگا بلکہ موضوع کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔کسی تحریر کا ماحول ہی زبان کی اس مخصوص بناوٹ کو تشکیل دیتا ہے، جو ترجمہ ہو کر بھی اسی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے۔مترجم کا اظہار ذاتی نہیں ہوتا بلکہ وہ اصل متن سے حاصل کرتا ہے۔یہی ترجمے کی ساختیاتی حقیقت ہوتی ہے۔اگر مترجم کے اپنے نظریات، مشاہدات اور تجربات ترجمے میں در آئیں تو وہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ''ماخوذ'' بن جاتا ہے۔

بہرحال ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس میں ایک زبان کے الفاظ کا متبادل دوسری زبان میں تلاش کر لینا ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ متن کی اصل روح اور منشائے مصنف تک رسائی حاصل کر لینا زیادہ اہم ہوتا ہے۔کیوں کہ اکثر یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ مترجم جس متن کا ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان میں کر رہا ہے اس زبان میں ہو بہو مترادفات، متبادل الفاظ اور محاورے دستیاب ہوں۔شوپنہار نے 1851ء میں کہا تھا کہ ''کسی بھی زبان کی ہو بہو نقل دوسری زبان میں بھی مل جائے یہ ناممکن ہے۔'' شوپنہار کی بات کو اس لئے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ زبان اپنے ساتھ تمام تر سماجی عوامل کو ساتھ لے کر بنتی ہے۔اس میں معاشرے میں رائج مذاہب، اعتقادات اور افکار سے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات وجود میں آتی ہیں (جو علاقائی تناظر کی بھی حامل ہوتی ہیں) اور یہ ضروری نہیں کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کا مذہب اعتقادات اور افکار بھی وہی ہو جو اصل مصنف کے ہوں۔

ترجمے کو بخوبی انجام دینے کے لئے نہ صرف زبان پر کامل عبور حاصل کرنا شرط ہے بلکہ دونوں زبانوں کے تاریخی ارتقا، ان زبانوں کے تاریخی حالات، علاقائی زبانوں کے ان زبانوں پر اثرات کو بھی سمجھنا ضروری ہوگا۔

ترجمے میں اکثر صنعتوں کا مسئلہ آتا ہے مثلاً کہیں صنعت تلمیح استعمال ہوئی ہے تو اس تاریخی واقعے کو فٹ نوٹ میں درج کر دینا چاہیئے۔تا کہ قاری پوری طرح مفہوم سے آگاہ ہو جائے۔مثال کے طور پر اگر اقبال کے

اس شعر کو ہندی میں ترجمہ کریں

کشتیٔ مسکین و جان پاک و دیوار یتیم

علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

تو قرآن کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔ تا کہ حضرت خضر اور موسیٰ کے درمیان ہوئے واقعے تک قاری کی رسائی ہو جائے۔

فن ترجمہ نگاری اور لسانیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی ترجمہ اس وقت تک حقیقی معنوں میں کامیاب نہیں کہا جا سکتا جب تک اس کی زبان کے بنیادی ڈھانچے کا مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ کیوں کہ کسی بھی زبان میں جس طرح لفظیات کی کئی تہیں ہوتی ہیں اسی طرح زبان کے محاورے، اس کے مترادفات اور متضاد الفاظ کا گہرا مطالعہ زبان کی ہیئت اور مفہوم تک پہنچنے کے لئے از حد ضروری ہے۔

لفظی یا لفظ بہ لفظ ترجمے کا سب سے اولین طریقہ ہے جو غیر ادبی کاموں کے لئے مناسب ہے۔ حالانکہ کسی بھی زبان میں ہر لفظ کا بالکل صحیح مترادف تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر زبان کے متن کو ہر زبان میں ترجمہ کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً ہندی زبان کے کسی متن کو اردو میں ترجمہ کرنا جتنا آسان ہے انگریزی، لاطینی یا افریقی زبانوں میں ترجمہ کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس کی وجہ لسانی رشتے ہیں جو زبانوں کے درمیان پہلے سے کسی ایک لسانی خاندان سے منسلک ہونے کی وجہ سے موجود ہوتے ہیں۔ ایسی زبانوں کو Cognate Language کہا جاتا ہے (کاگنیٹ لینگویج وہ ہوتی ہیں جو کسی ایک لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں)۔ ایک لسانی گروہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے ایسی اصطلاحیں یا الفاظ زبان میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں جو مفہوم کی ادائیگی میں آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔

ایسی زبانوں کا ایک خاندان سے ہونے کی وجہ سے لسانی و فکری لین دین صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے ان کے یہاں زندگی اور کائنات سے متعلق تصورات کا لین دین ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر نظریات سے تعلق رکھنے والے الفاظ، محاورات، استعارات اور تشبیہوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ان میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر قطعی نہیں تو کم سے کم کام چلاؤ متبادل الفاظ و محاورے تھوڑی سی کوشش کے بعد مل جاتے ہیں، جن کی وجہ سے ترجمہ کرنے میں خاصی آسانی ہو جاتی ہے۔

14.5۔ ترجمے کے امتیازات

گوئٹے کا قول ہے:

''جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں، ان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔''

تاریخ سے اس بات کے حوالے ملتے ہیں کہ تہذیبوں نے ایک دوسرے سے افکار و تصورات اور زندگی

گزارنے کےطورطریقے سیکھے ہیں۔ یہ عمل بنیادی طور پرلسانی سرگرمی تھی۔لوگ ایک دوسرے کی زبان سیکھتے،زبان سیکھنے کے درمیان وہ ایک دوسرے کی ثقافت سے شناسائی حاصل کرتے،ایک دوسرے کی طرز زندگی میں جو باتیں ان کےاپنے مزاج کے مطابق ہوتیں قبول کرتے۔اس طرح تہذیب وثقافت کا ارتقا ہوتا رہا۔

تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی ایک صورت ترجمہ بھی ہے۔ترجمہ ایک ایسافن ہے،جس نے انسانی علم اورتہذیب کی ترقی میں اہم کردارادا کیا ہے۔اس فن کے ذریعےلوگوں نے ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھا، انسان نے جو کچھ تخلیق کیا تھااس سے فائدہ اٹھایا۔

''عالمی ادب کےتصور کوایک ٹھوس حقیقت میں کرنے کے لئے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔''(پروفیسرایکزٹ گیراڈ)

ترجمے کافن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطۂ نظر پیدا کرنے کاوسیلہ بھی ہےاوراقوام عالم کی فکر،نظریات اورخیالات کوسمجھنے کا ذریعہ بھی،ترجمے کےامتیازات میں یہ چیز بطورخاص شامل ہے کہ اس کی وسعت آفاق جیسی ہے جوانسانی سوچ کے دریچوں کومزید کشادگی عطا کرتی ہے۔قومی بصیرت اور شناخت کونمایاں کرتی ہے۔

آج اس گلوبل ویلیج میں ترجمے کے ذریعے سے ہی جدیدعلوم وفنون،سائنس،طب اورٹکنالوجی کے علاوہ بہت سے نئےتصورات اور خیالات کوسمجھنے، دنیا کےمختلف خطوں میں بسنے والی اقوام اوران کی مختلف زبانوں کے قریب لانے میں ترجمہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔اقوام عالم میں زبان وادب ابتدا سے ہی مشترکہ سرمایہ تصور کئے جاتے رہے ہیں اوراس سرمائے کووسعت دینے میں ترجمہ بنیاد ہے۔ کیوں کہ ترجمے کے ذریعے زبان کئی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے۔ترجمہ جہاں الفاظ اور زبان کی نشوونما کے ذریعے انسانی علوم میں اضافے کا باعث بنتا ہے وہیں ذہنی سرحدوں کوبھی کشادگی بخشتا ہے۔زبانوں کی یہ ترقی کئی سطحوں سے ہوتی ہے مثلاً ذخیرہ الفاظ کا تبادلہ، محاوروں اورمحاکات میں تبادلہ، دنیا کے بڑے بڑے مفکروں،دانشوروں اورشاعروں کی فکرترجمے کے ذریعے ہی ہم تک پہنچتی ہےاوردیگراقوام کے عالی دماغ کی تخلیقات کوہم ترجمے کے ذریعے ہی جانتے ہیں۔

یہ بات عالمی سطح پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ ایک ملک کے اندر رہتے ہوئے کثیرلسانی سماج میں بھی سچ ثابت ہوتی ہے۔جس کی مثال ہندوستان میں اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کا آپس میں بڑھتا ہوا میل جول ہے۔اس لسانی،ادبی وثقافتی میل جول سے قومی یکجہتی کوبھی فروغ ملتا ہے۔لیکن اس فروغ کا راستہ ترجمے کی وادی سے ہوکرہی گزرتا ہے۔اس سلسلے میں رشیدامجد لکھتے ہیں:

''عہد جدید میں یہ ایک ضرورت بھی ہے جس کے بغیر عالمی سطح کی علمی وادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقراررکھنے کے لئے گلوبل علم سے واقفیت حاصل کرنے اور جدیدٹکنالوجی کا ساتھ

دینے کے لئے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔'' (رشید امجد، ترجمہ کا فن، مشمولہ رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1988ء، ص، 23)

جس طرح ہم دیگر ممالک سے اشیائے ضرورت، جدید ٹکنالوجی، مشینری، آلات، سامان طب و سائنس منگوا کر اپنی زندگی میں تبدیلی لانے کے خواہش مند رہتے ہیں اور اس کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم جدید تحقیق برائے علم، سائنس، فلسفہ، ادب، سیاست، زراعت و دیگر علوم کو ترجمے کے ذریعے اپنا کر مختلف شعبوں میں مزید ترقی کر سکتے ہیں۔ کسی خطے کی معاشرت، تہذیبی فضا کی نشو و نما کے لئے ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ

''ترجمہ ایک زبان کے علمی اور ادبی سرمائے کو دوسری زبان بولنے والے انسانی گروہ تک پہنچاتا ہے۔ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرتا ہے اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور ربط و ضبط کی راہیں کھولتا ہے۔'' (سجاد حیدر پرویز، اردو اور سرائیکی کے باہم تراجم، سرائیکی ادبی بورڈ، رجسٹرڈ ملتان، 2001ء، ص، 13)

علم کی وسعت اور علمی و سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ الثانیہ میں عربی کا بھی ہاتھ ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعے علوم و فنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اسی لئے روز بروز ترجمے کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پالیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں اصل کے تمام محاسن آ ہی نہیں سکتے۔ یہ بات مشرقی ترجمے کے لئے یا ان زبانوں کے لئے تو ٹھیک ہے جو ابھی ترقی یافتہ نہیں ہیں اور جو ہر قسم کے معنی و مطالب کے اظہار پر قادر نہ ہوں۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اب اس مرحلے پر پہنچ گئی ہیں کہ وہ کم از کم نثری تخلیقیت کو بجنسہٖ زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ کسی دوسری زبان سے براہ راست استفادہ کرنے والے ہمیشہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمے کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

دوسری زبانوں سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کا عمل دوسری تہذیب کو اپنی طرف کھینچ لانے کا عمل ہے۔ ترجمے کا دوسرا رخ اپنے آپ کو دوسری تہذیبوں تک لے جانے کا ہے۔

14.6۔ خلاصہ

ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس کی ضرورت اور اہمیت دنیا کی رنگارنگی، فکر و خیال کی ہمہ جہتی، زبان کی توسیع اور باہمی رابطے کے لئے محسوس کی جاتی ہے۔ چنانچہ سماجی ارتقا، علوم و فنون کا لین دین، تہذیب و تمدن کا ملاپ اور زبانوں کے فروغ میں ترجمہ بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے حاصل کی گئی نئی اصطلاحیں، ترکیبیں،

ہیئتیں اور ساختیں زبان کے حسن کو دوبالا کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

ترجمے کو یوں تو ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو کہتے ہیں لیکن لفظ و معنی کا یہ لین دین بہت سی مشکلات اور بندشیں بھی رکھتا ہے۔

ترجمہ ایک ایسا جھروکہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں۔ لیکن عہد حاضر میں یہ ایک ایسی ضرورت بن گیا ہے جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے اسے گلوبل علم سے واقف کرانے اور جدید ٹکنالوجی کا ساتھ دینے کے لئے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت بن گیا ہے۔

گو کہ دنیا میں جہاں اس کی سخت ضرورت ہے وہیں اسے وہ مقام نہیں دیا گیا جو اس کا حق ہے۔ ترقی یافتہ سماج میں قومیں ایک دوسرے کے تجربات و مشاہدات سے استفادہ کرتی ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں اس جذبے کی ابھی بہت کمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں اس کمی کی طرف توجہ کی جائے۔

14.7۔ آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے ذریعے ہم نے:

1- ترجمے کی مختلف اقسام کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔
2- یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کیا کسی متن کو ہو بہو دوسری زبان میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔
3- ترجمے کے لسانی مسائل سے آگاہی حاصل کی۔
4- ترجمے کے امتیازات سے واقفیت حاصل کی۔
5- ترجمہ کرتے وقت پیش آنے والی مشکلات کو سمجھا۔

14.8۔ اپنا امتحان خود لیجئے

1- ترجمے کا اصل مقصد کیا ہے؟
2- تشکیل کے کیا معنی ہیں؟
3- کسی تلمیح کا ترجمہ کیسے کریں؟
4- موضوعاتی قسم کے تراجم میں کون کون سے تراجم آتے ہیں؟
5- صحافتی ترجمے میں کس قسم کے ترجمے کی ضرورت نہیں ہوتی؟

14.9۔ فرہنگ

الفاظ	معنی

صنائع بدائع	لفظی ومعنوی صنعتیں جوعلم بدیع کے ذیل میں آتی ہیں۔
فصاحت	خوش کلامی
بلاغت	فصیح کلام،حسب موقع گفتگو
ہم آہنگ	ہم آواز،متفق الرائے
بنیادی متن	اصل عبارت یاتحریر
افادیت	فائدہ
تناظر	منظر،حالت، پرسپکٹیو
پیش رفت	آگے جانا
معروضی	واقعی،خارجی
ساختیاتی	بناوٹ سے متعلق
ماخوذ	اخذ کیا گیا،لیا گیا
درآنا	اندرآجانا،داخل ہوجانا
مترادفات	مترادف کی جمع،دوایسے الفاظ جن کے معنی ایک جیسے ہوں
متبادل	بدلنے والا
زمرہ	گروہ،جتھا
انسلاک	وابستگی،منسلک ہونا، پرویاجانا
ہیئت	ہیئت،شکل،فارم
کثیرلسانی	کئی زبانوں والی

14.10۔ سوالات کے جوابات

1- ایک زبان کے متن کودوسری زبان میں منتقل کرنا

2- کسی چیزکوبنانا

3- فٹ نوٹ میں تلمیح کے واقعے کی تفصیل لکھ دیں۔

4- علمی ترجمہ،ادبی ترجمہ اورصحافتی ترجمہ۔

5- صحافتی ترجمے میں لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ ترجمے کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

14.11۔ کتب برائے مطالعہ

1- اعجاز راہی (مرتب)،اردوزبان میں ترجمے کے مسائل،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،1994ء

2- خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، 1990ء
3- قمر رئیس، ترجمے کا فن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1976ء
4- مرزا حامد بیگ، مغرب کے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1988
5- نثار احمد قریشی، ترجمہ روایت اور فن، اسلام آباد، 1985ء